ثبوت زندہ ہیں

قرآن: ایک لازوال معجزہ

ذوالقرنین، سدذوالقرنین اور یاجوج ماجوج کے متعلق مفسرین و

مؤرخین کی تمام تر تشریحات اور تصورات کو بیخ و بن سے بدل

دینے پر مجبور کردینے والی تحریر

مفتی عبدالعزیز ابن احمد پٹیل

فاضل دارالعلوم، دیوبند

☆ ذوالقرنین،سدذوالقرنین اور یاجوج ماجوج

ذوالقرنین کوئی بادشاہ تھے، نبی تھے یا پھر غیر معمولی اختیار وقدرت کی حامل کوئی ہستی؟

سدذوالقرنین کی حقیقت کیا ہے؟ کیا وہ دو پہاڑوں کے درمیان بنی کوئی دیوار ہے یا کچھ اور؟

یاجوج اور ماجوج کون ہیں؟ کیا وہ انسانی نسل سے تعلق رکھنے والی اور شریعت کی پابند کوئی قوم ہے یا پھر کوئی غیر مکلف مخلوق؟ اس وقت کہاں پر ہیں؟ کب اور کہاں سے نکلیں گے؟

وہ مقامات اور قومیں آج کہاں آباد ہیں جہاں جہاں ذوالقرنین تشریف لے گئے؟

☆ سائنس کیا ہے؟

کیا سائنسی ترقی دور جدید کے ارتقاء یافتہ انسانی دماغ کی پیداوار ہے یا پھر خالق کائنات کے تکوینی نظام اور طریق ربوبیت کا حصہ؟

سائنس کا ماضی، حال اور مستقبل، نظام شمسی، زمین کی ہیئت، دوری ومحوری گردش کے علاوہ بہت سارے انکشافات اور کئی ایک سائنسی عقدوں کا حل۔

☆ برمیوڈا ٹرائنگل یا ردم ذوالقرنین

جانیے بے شمار لوگوں کے علاوہ ہزاروں آبی جہازوں اور طیاروں کو لقمۂ اجل بنادینے والی دنیا کی پر اسرار ترین جگہ ''برمیوڈا ٹرائنگل'' کی ہولناکی کا راز جس کے عقدے کو دورِ جدید کی گوناگوں سائنسی ترقیات کے باوجود حل نہیں کیا جاسکا۔

اور کون ہے اس کا معمارِ اعظم؟

☆ قرآن: ایک لازوال معجزہ

آیتوں کے غلط ترجموں کی بنیاد پر قرآنِ عظیم کو کلام اللہ کے بجائے انسانی کاوش ثابت کرنے والے مستشرقین، ملحدین اور مشرکین کو انگشت بدنداں کردینے والے جواب۔

☆ ثبوت زندہ ہیں

ذوالقرنین یعنی بحری، بری اور فضائی سواریوں کے ذریعہ دنیا بھر کا سفر کرکے انسانوں کے تکوینی مسائل حل کرنے والا تاریخِ انسانی کا واحد ایسا شخص جو جغرافیہ، طبیعیات اور کیمسٹری کا بادشاہ تھا۔

☆ تاریخ میں پہلی بار

واقعۂ ذوالقرنین کے متعلق تاریخی، تفسیری، لغوی، نحوی، صرفی، جغرافیائی اور سائنسی چہ میگوئیوں اور تمام قیل وقال کا قطعی اور ٹھوس دلائل کی بنیاد پر خاتمہ۔

اعوذ بالله من الشيطان الرجيم

بسم الله الرحمن الرحيم

وَيَسْأَلُونَكَ عَن ذِي الْقَرْنَيْنِ ۖ قُلْ سَأَتْلُو عَلَيْكُم مِّنْهُ ذِكْرًا ﴿٨٣﴾ إِنَّا مَكَّنَّا لَهُ فِي
الْأَرْضِ وَآتَيْنَاهُ مِن كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ﴿٨٤﴾ فَأَتْبَعَ سَبَبًا ﴿٨٥﴾ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ
مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَوَجَدَ عِندَهَا قَوْمًا ۗ قُلْنَا يَا ذَا
الْقَرْنَيْنِ إِمَّا أَن تُعَذِّبَ وَإِمَّا أَن تَتَّخِذَ فِيهِمْ حُسْنًا ﴿٨٦﴾ قَالَ أَمَّا مَن ظَلَمَ
فَسَوْفَ نُعَذِّبُهُ ثُمَّ يُرَدُّ إِلَىٰ رَبِّهِ فَيُعَذِّبُهُ عَذَابًا نُّكْرًا ﴿٨٧﴾ وَأَمَّا مَنْ آمَنَ وَعَمِلَ
صَالِحًا فَلَهُ جَزَاءَ الْحُسْنَىٰ ۖ وَسَنَقُولُ لَهُ مِنْ أَمْرِنَا يُسْرًا ﴿٨٨﴾ ثُمَّ أَتْبَعَ سَبَبًا
﴿٨٩﴾ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلَىٰ قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَل لَّهُم مِّن
دُونِهَا سِتْرًا ﴿٩٠﴾ كَذَٰلِكَ وَقَدْ أَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ﴿٩١﴾ ثُمَّ أَتْبَعَ سَبَبًا
﴿٩٢﴾ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِن دُونِهِمَا قَوْمًا لَّا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ
قَوْلًا ﴿٩٣﴾ قَالُوا يَا ذَا الْقَرْنَيْنِ إِنَّ يَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ مُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ فَهَلْ
نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلَىٰ أَن تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ﴿٩٤﴾ قَالَ مَا مَكَّنِّي فِيهِ
رَبِّي خَيْرٌ فَأَعِينُونِي بِقُوَّةٍ أَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ﴿٩٥﴾ آتُونِي زُبَرَ الْحَدِيدِ ۖ
حَتَّىٰ إِذَا سَاوَىٰ بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انفُخُوا ۖ حَتَّىٰ إِذَا جَعَلَهُ نَارًا قَالَ آتُونِي
أُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا ﴿٩٦﴾ فَمَا اسْطَاعُوا أَن يَظْهَرُوهُ وَمَا اسْتَطَاعُوا لَهُ نَقْبًا
﴿٩٧﴾ قَالَ هَٰذَا رَحْمَةٌ مِّن رَّبِّي ۖ فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ رَبِّي جَعَلَهُ دَكَّاءَ ۖ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّي حَقًّا
﴿٩٨﴾ وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَمُوجُ فِي بَعْضٍ ۖ وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَجَمَعْنَاهُمْ جَمْعًا
﴿٩٩﴾ وَعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكَافِرِينَ عَرْضًا ﴿١٠٠﴾

سورۂ کہف کی ان آیات میں ذوالقرنین ، ردم ذوالقرنین اور یاجوج و ماجوج کا تذکرہ موجود ہے۔ یہ وہ مباحث ہیں جو تاریخ میں ہمیشہ ہی بحث وتمحیص کا موضوع رہے ہیں ،ان آیتوں کے غلط تراجم وتفاسیر کی بنیاد پر دورجدید کے کفار اور مستشرقین کو اسلام کے خلاف کھل کر یہ کہنے کا موقع ملا کہ آج سیٹلائٹ کا زمانہ ہے،جس نے زمین کے چپے چپے کی تصویر اتارلی ہے،اگر یاجوج وماجوج کا کہیں کوئی وجود ہوتا یا ان کو روکے رکھنے والی کوئی ایسی دیوہیکل دیوار ہوتی تو ہمیں وہ ضرورنظر آتی۔توکسی نے کہا کہ اگر قرآن اللہ کی کتاب ہوتی تو اس میں ایسی بات نہ کہی جاتی کہ سورج کیچڑ والے پانی کے چشمہ میں ڈوبتا ہے۔وغیرہ وغیرہ

آیئے حتمی دلائل پر مبنی ان آیتوں کے صحیح معانی ومفاہیم کو سمجھنے کے علاوہ قرآن کے لازوال معجزہ ہونے پر دلالت کرنے والے زندہ ثبوتوں پرنظر ڈالتے ہوئے یہ بھی دیکھتے جائیں کہ قرآن نے ان آیات میں کیسے کیسے اسراراور سائنسی عقدوں سے پردہ اٹھایا ہے جوصرف ایک عام آدمی کے لئے نہیں بلکہ خود سائنس دانوں کو ورطۂ حیرت میں ڈالنے کے لئے کافی ہیں۔

کفارعرب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تین سوال کئے تھے،جن میں ایک یہ تھا کہ ذوالقرنین کون تھے؟ قرآن نے اس کا جواب دیتے ہوئے رسول اللہ کی زبانی فرمایا: وَيَسْأَلُونَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ ۖ قُلْ سَأَتْلُو عَلَيْكُمْ مِنْهُ ذِكْرًا ﴿٨٣﴾ إِنَّا مَكَّنَّا لَهُ فِي الْأَرْضِ وَآتَيْنَاهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ﴿٨٤﴾

ترجمہ: وہ آپ سے ذوالقرنین کا حال پوچھتے ہیں،آپ کہیے کہ میں تم لوگوں کو اس

کا کچھ سبق آموز حال کہہ سناتا ہوں۔

اس آیت میں وارد ''أَتْلُو'' اور ''ذِكْرًا'' کے الفاظ سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ذوالقرنین کا جو حال بیان فرمائینگے وہ مختصر تو ہوگا لیکن ساتھ ساتھ ایسا مدلل بھی ہوگا کہ قیامت تک آنے والوں کے لئے یاددہانی اور نصیحت کا ذریعہ بن جائے۔

چنانچہ اگلی آیت میں فرمایا: إِنَّا مَكَّنَّا لَهُ فِي الْأَرْضِ وَآتَيْنَاهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ﴿٨٤﴾ ہم نے اسے زمین کے (تکوینی) معاملات میں قدرت دے رکھی تھی اور اسے ہر طرح کے وسائل حمل ونقل عطا کئے تھے۔

''مَكَّنَّا لَهُ فِي الْأَرْضِ '' کا ترجمہ ''زمین کے تکوینی معاملات میں قدرت واختیار'' کیوں کیا گیا ہے، ''كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا '' سے مراد وسائل حمل و نقل اور سواریاں کیوں ہے؟ ان دونوں میں آخر کیا ربط اور راز ہے، وہ اگلے صفحات میں بالدلائل ملاحظہ فرمائیں۔

مقام اول: منطقۂ باردہ جنوبی

(South Polar Region)

فَأَتْبَعَ سَبَبًا ﴿٨٥﴾ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ۗ قُلْنَا يَا ذَا الْقَرْنَيْنِ إِمَّا أَنْ تُعَذِّبَ وَإِمَّا أَنْ تَتَّخِذَ فِيهِمْ حُسْنًا ﴿٨٦﴾

سورۂ کہف کی آیت نمبر ۸۶ مستشرقین کی جانب سے اٹھائے جانے والے ان اشکالات میں سب سے اول ہے جس کے مطابق دعوی کیا جاتا ہے کہ اگر قرآن اللہ کا کلام ہوتا تو وہ یہ نہ کہتا ہے کہ ''سورج کیچڑ والے پانی کے چشمہ میں ڈوبتا ہے۔''

آیتوں کے اسرار ورموز اور صحیح مفاہیم کو بیان کرنے سے پہلے قدیم وجدید مفسرین کا وہ ترجمہ پیش کیا جاتا ہے جسے بنیاد بنا کر غیر مسلمین نے مذکورہ بالا اعتراض داغنے کی جرأت کی ہے۔

ترجمہ: چنانچہ اس نے ایک راہ پکڑی، حتی کہ جب وہ غروب آفتاب کی حد تک پہنچ گیا تو اس نے سورج کو ایک کیچڑ والے چشمے میں ڈوبتے دیکھا۔

ذخیرہ اسلامی کی تقریبا تمام قدیم وجدید تفاسیر جیسے طبری، قرطبی، خازن، جلالین، بیضاوی، الرازی، ابن کثیر، روح المعانی، مفاتیح الغیبیہ، محاسن التاویل، فی ظلال القرآن اور اردو مترجمین میں مولانا محمود الحسن گنگوہی، مولانا ابو الاعلی مودودی، جناب غلام احمد پرویز سے لیکر مولانا وحید الدین خان اور جاوید احمد غامدی صاحب تک سبھی نے مذکورہ آیت کا تقریباً ایک جیسا ہی مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ذوالقرنین جب اقصائے مغرب میں پہنچے تو انہیں ایسا محسوس ہوا گویا کہ سورج کیچڑ والے چشمے یا کالے پانی میں ڈوب رہا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں

وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ حَمِئَةٍ" ذَاتَ حَمَأَةٍ وَهِيَ الطِّين الْأَسْوَد وَغُرُوبهَا فِي الْعَيْن فِي رَأْي الْعَيْن. جلالین

بل المراد أنه انتهى إلى آخر العمارة من جهة المغرب ومن جهة المشرق، فوجدها في رأي العين تغرب في عين حمئة. القرطبي

وقوله: { وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ حَمِئَةٍ } أي: رأى الشمس في منظره تغرب في البحر المحيط، وهذا شأن كل من انتهى إلى ساحله، يراها كأنها تغرب فيه. ابن كثير

آیت کے صحیح مفہوم کو سمجھنے کے لئے اس میں موجود ''مَغْرِبَ الشَّمْسِ'' ''وَجَدَهَا تَغْرُبُ'' اور ''عَيْنٍ حَمِئَةٍ'' ان تین جملوں کو اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے۔

مغرب الشمس کیا ہے؟

لغتاً مغرب اسم ظرف کا صیغہ ہے جس کا معنی ہے غروب ہونے کی جگہ، جبکہ اصطلاحاً مغرب کا معنی ہے زمین کا وہ علاقہ جس کے افق سے سورج غروب ہوجائے، اسی طرح لغت میں مطلع کا معنی ہے طلوع ہونے کی جگہ جبکہ اصطلاحا مطلع سے مراد زمین کا وہ علاقہ ہوتا ہے جس کے افق پر سورج طلوع ہو۔

یہ بات ذہن نشیں رہے کہ قرآن میں مشرق و مغرب کے الفاظ سمت کے لئے بھی استعمال ہوئے ہیں لیکن انتہائے مشرق و انتہائے مغرب پر دلالت کرنے والے کوئی الفاظ قرآن میں موجود نہیں چونکہ انتہاء پر دلالت کرنے والے الفاظ ''مسطح زمین'' کے نظریہ کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اور یہ نظریہ خلاف واقعہ ہے، نہ سائنس اس کی تصدیق کرتی ہے اور نہ قرآن۔ قرآن زمین کے لئے متعدد مشارق

ومغارب کا ہونا بیان کرتا ہے اور یہ بات زمین کے گول ہونے کالازمہ ہے۔

الغرض ذوالقرنین انہیں مغارب میں سے ایک مغرب میں تشریف لے گئے، آیئے دیکھتے ہیں، وہ مغرب دوسرے مغارب سے کیسے مختلف تھا ؟

''غربت الشّمس فی مکان کذا'' کا معنی کیا ہے؟

غرب، یغرب، غربۃ و غربا و غرابۃ کا معنی ہے دور ہونا، پردیسی ہونا۔ جب اس کا فاعل ''النجم یا الشّمس'' جیسے آسمانی اجرام ہوں تو اس کا معنی نظروں سے اوجھل ہونا، چھپنا اور غائب ہونا کیا جاتا ہے، جیسے غرب النجم: ستارہ غائب ہوگیا۔ جب غرب کا صلہ ''عن'' آئے جیسے غرب زید عنا تو اس کا معنی ہوتا ہے: زید ہم سے جدا ہوگیا۔ لیکن جب غرب کا صلہ ''فی مکان'' آئے تو اس کا معنی ہوتا ہے ''غیر معمولی طور پر اس علاقہ سے بہت دور چلے جانا'' جیسے تغرب زید فی الارض: زید اپنے وطن سے کافی دور چلا گیا۔ اسی طرح ''غرب فی سفرہ'' وہ دور دراز سفر پہ نکل گیا۔ اگر کوئی شخص سفر پر جائے اور اپنے معمول کے مطابق کچھ روز بعد واپس چلا آئے تو ایسے شخص کے لئے تغرب فی الارض کا استعمال درست نہیں ہوگا، بلکہ یہ جملہ تبھی بولا جائیگا جب کوئی شخص غیر معمولی طور پر اپنے وطن سے دور دراز نکل جائے اور اپنے علاقے میں لمبی مدت کے لئے نظر نہ آئے۔

دراصل ''غرب فی مکان کذا'' کنایہ ہے اپنے وطن اور علاقہ سے روپوش ہوجانے اور دور دراز چلے جانے سے۔ اب جس طرح غرب فی سفرہ

اور تغرب زید فی الارض کا ترجمہ کوئی یہ نہیں کرتا کہ زید زمین میں گھس گیا یا ڈوب گیا اسی طرح وجدھا تغرب فی عین حمئۃ کا یہ ترجمہ درست نہیں کہ سورج کیچڑ والے چشمے میں ڈوبتا ہے، بلکہ ''الشمس تغرب فی مکان کذا '' کا صحیح مطلب یہ ہوگا کہ سورج اس علاقے میں غیر معمولی طور پر نظر نہیں آتا۔

چوبیس گھنٹوں میں سورج کا طلوع وغروب ہونا ایک معمول کا واقعہ ہے، اس طرح کے معمول کو ظاہر کرنے کے لئے تطلع و تغرب الشمس کی تراکیب استعمال کی جاتی ہیں، اس قسم کے معمول کے مطابق چلنے والے دورانیہ کے لئے'' تغرب الشمس فی مکان کذا '' کا استعمال درست نہیں ہوگا ''غربت فی مکان کذا '' کا استعمال تبھی درست ہوگا جب وقفۂ غروب غیر معمولی ہو اور غیر معمولی غروب تبھی کہلا ئیگا جب سورج چوبیس گھنٹے یا اس سے زائد وقت کے لئے نظر نہ آئے۔

وجدھا تغرب

فعل وجد دو طرح کا ہوتا ہے، ایک سادہ اور دوسرا افعال قلوب میں سے، افعال قلوب جنہیں افعال شک ویقین بھی کہا جاتا ہے، ان کی تعداد کل سات ہیں۔ حسب، ظن، خال۔ ان تینوں کا استعمال خبر میں شک کے اظہار کے لئے ہوتا ہے۔ ''علم، رأی اور وجد'' یہ تینوں خبر میں یقین کے اظہار لئے مستعمل ہیں جبکہ زعم شک و یقین دونوں کے لئے مستعمل ہے۔

جب فعل ''وجد'' عام فعل ہو تو ایک ہی مفعول سے بات ختم ہو جاتی ہے جیسے

وَإِن كُنتُمْ عَلَىٰ سَفَرٍ وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا فَرِهَانٌ مَّقْبُوضَةٌ ﴿۲۸۳ البقرة﴾

فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا آتَيْنَاهُ رَحْمَةً مِّنْ عِندِنَا ﴿۶۵ الكهف﴾

قَالَ مَعَاذَ اللَّهِ أَن نَّأْخُذَ إِلَّا مَن وَجَدْنَا مَتَاعَنَا عِندَهُ ﴿۷۹ یوسف﴾

لیکن ''وجد'' جب افعال قلوب میں سے ہو تو وہ جملہ اسمیہ پر داخل ہو کر اسے حال اور ذوالحال میں بدل دیتا ہے، مابعد آنے والے دونوں جز کبھی اسم ہوتے ہیں تو کبھی پہلا جز اسم اور دوسرا مضارع ہوتا ہے جیسے وإِنَّا وَجَدْنَاهُ صَابِرًا نِّعْمَ الْعَبْدُ إِنَّهُ أَوَّابٌ ﴿۴۴ ص﴾

فَوَجَدَا فِيهَا جِدَارًا يُرِيدُ أَن يَنقَضَّ فَأَقَامَهُ ﴿۷۷ الكهف﴾

قَالُوا وَجَدْنَا آبَاءَنَا لَهَا عَابِدِينَ ﴿۵۳ الأنبياء﴾

وَجَدتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُونَ لِلشَّمْسِ مِن دُونِ اللَّهِ ﴿۲۴ النمل﴾

چند نکات ملحوظ نظر رہیں

ایک : وجدان افعال قلوب میں سے ہے جو خبر میں یقین کا معنی پیدا کرتے ہیں، یعنی جس کی خبر دی جا رہی ہے وہ قائل کے مطابق یقینا ایسی ہی ہے۔لہٰذا اس کا ترجمہ فِي رَأْيِ الْعَيْنِ یعنی (گویا ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کیچڑ والے چشمہ میں ڈوب رہا ہو) کرنا کیسے درست ہے؟ قرآن میں ڈھیروں مقامات پر وجد اور اس کے مشتقات کا استعمال ہوا ہے لیکن ان میں سے ایک بھی مثال ایسی پیش نہیں کی جا سکتی جس میں ''فِي رَأْيِ الْعَيْنِ'' جیسا کوئی ترجمہ کیا جا سکے، اگر اس قسم کے تصور اور تخیل کا معنی ہی بتلانا مقصود ہوتا تو پھر یہاں بھی

مذکورہ ذیل آیتوں کی طرح ''حسب اور خیال'' سے بنی کوئی تعبیر استعمال کی جاسکتی تھی۔

أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْآنُ مَاءً ﴿٣٩ النور﴾

قَالَ بَلْ أَلْقُوا ۖ فَإِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِن سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعَىٰ ﴿٦٦﴾

دو : یہاں ایک قابل توجہ بات یہ بھی ہے کہ علم النحو کی کتابوں میں لکھا ہے کہ افعال قلوب کے مابعد آنے والے جملہ اسمیہ کے دونوں جز مفعول بہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہوتے ہیں، اور دونوں مفعول ایک کے قائم مقام ہوتے ہیں۔ یہ بات درست نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ افعال قلوب جملہ اسمیہ پر داخل ہوکر اسے حال اور ذوالحال میں بدل دیتے ہیں، چنانچہ دوسرا جز حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہوتا ہے نہ کہ مفعول بہ ہونے کی وجہ سے۔

جملہ اسمیہ کو حال اور ذوالحال میں بدل دینے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اسکے معنی میں امتداد اور ایک قسم کا تسلسل پیدا ہوجاتا ہے۔ جیسے قَالُوا وَجَدْنَا آبَاءَنَا لَهَا عَابِدِينَ ﴿٥٣ الأنبياء﴾

فَوَجَدَا فِيهَا جِدَارًا يُرِيدُ أَن يَنقَضَّ فَأَقَامَهُ ﴿٧٧ الكهف﴾

إِنِّي وَجَدتُّ امْرَأَةً تَمْلِكُهُمْ وَأُوتِيَتْ مِن كُلِّ شَيْءٍ ﴿٢٣ النمل﴾

ٹھیک اسی طرح وجد الشمس تغرب فی مکان کذا کا ترجمہ ہوگا اس نے فلاں جگہ پہ سورج کو مسلسل بحالت غروب پایا یعنی اس جگہ پہ سورج غیر معمولی

طور پہ چوبیسوں گھنٹے نظر نہیں آتا تھا۔

الغرض غرب کا صلہ فی مکان ہونے کی وجہ سے اس میں غیر معمولی طور پر نظر نہ آنے کا معنی پہلے ہی موجود تھا لیکن وجد کے دخول نے اس معنی میں مزید امتداد پیدا کر دیا۔

الحاصل ذوالقرنین جس مغرب میں تشریف لے گئے ان دنوں وہاں چوبیسوں گھنٹے کی مسلسل رات رہتی تھی۔ آیئے اب جانتے ہیں وہ علاقہ کونسا تھا؟

عَيْنٍ حَمِئَةٍ کیا ہے؟

تقریبا تمام مفسرین نے'' عَيْنٍ حَمِئَةٍ '' کا ترجمہ ذات حَمْأَة و هو الطين الاسود یعنی ''بدبودار کالی مٹی والا چشمہ کیا ہے''، جبکہ کچھ دور جدید کے مترجمین نے اس کا ترجمہ کالے پانی سے کیا ہے۔

والحَمْأَةُ : الطِّيْنُ الأَسْوَدُ المُنْتِنُ، وعَيْنٌ حَمِئَةٌ: ذاتُ حَمْأَةٍ. المحيط فى اللغة

أي في عين ماء ذي طين وحمإ أسود ۔ كشاف

لیکن یہ مفہوم قطعی درست نہیں، اسکی بہت سی وجوہات ہیں۔آیئے ترتیب وار سمجھتے ہیں۔

العین عربی میں تقریبا ۳۲ معنوں میں مستعمل ہے، آنکھ، نقد، بذات خود، جاسوس، پانی کا چشمہ، نہر وغیرہ وغیرہ۔آیت مذکورہ میں بالاتفاق عین سے مراد پانی کا چشمہ ہے۔

العین کا حقیقی معنی ہے ''کسی بھی چیز کا اندرون یا گہرائی میں ہونا''۔ مثلاً جاسوس کو العین اس لئے نہیں کہتے کہ وہ آنکھ سے نگاہ رکھتا ہے بلکہ اس لئے کہ وہ مطلوبہ معاملہ کی تہہ اور اندر تک کی خبر رکھتا ہے۔ حاسۂ بصر یعنی آنکھ کو العین اس لئے کہتے ہیں کہ وہ بھی ہڈیوں کے اندر گہرائی میں ہوتی ہے۔ حدیث قرۃ عینی فی الصلوٰۃ کا ترجمہ لوگوں نے عام طور پر کیا ہے کہ ''میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے'' حالانکہ اس کا صحیح ترجمہ ہے ''میرے دل کا سکون نماز میں ہے''۔ ''قرۃ'' خفقان کی ضد ہے، اور یہ دل کی کیفیت ہے آنکھوں کی نہیں، اور دل بھی جسم کے اندر ہوتا ہے، ٹھیک اسی طرح العین کا اطلاق اپنے حقیقی معنی میں پانی کے اس چشمہ پر ہوتا ہے جو زمین کی چٹانی سطح کے نیچے بہتا ہے۔

ہم اپنی زبان میں سطح زمین سے نکلنے والے جس پانی کو جھرنا یا چشمہ کہتے ہیں وہ دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک وہ پانی ہوتا ہے جو موسم برسات میں زمین کی اوپری سطح میں اتر کر جمع ہوتا رہتا ہے اور سال بھر یا کہیں چھ چھ سات سات ماہ تک مٹی یا پتھر کی چٹانوں کی دراڑوں یا سوراخوں سے ہو کر بہتا رہتا ہے۔ جبکہ دوسری شکل وہ ہے جس میں پانی پتھر کی نچلی سطح سے پھوٹ کر چٹانوں کی راہ بہتا ہے، پہلی شکل کو عربی میں ینبوع اور دوسرے کو ''عین'' کہتے ہیں، ینبوع عین سے چھوٹا اور زمین کی اوپری سطح سے بہنے والا ہوتا ہے جبکہ ''العین'' ہر اس پانی کو کہا جائیگا جو زمین کی گہرائی میں ہو یا اندرونی چٹانوں سے پھوٹ کر بہتا ہو۔ چاہے وہ آبشار کی شکل میں ہو، نہر یا ندی کی شکل میں، طولاً بہتا ہو یا گولائی میں۔

لفظ ''عین'' میں صرف گہرائی کا معنی نہیں پایا جاتا بلکہ چوڑائی اور بہاؤ کا معنی بھی موجود ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ قرآن میں عین کو نہر کے مترادف کے طور پر بھی استعمال کیا گیا ہے۔ اسی لئے نہر کی طرح عین کے ساتھ بھی '' **فجر تفیجیرا** '' کی صفت کا اضافہ کیا گیا ہے، جبکہ ینبوع کے ساتھ کہیں بھی '' **یفجرونہا تفجیرا** '' یا گہرائی سے نکالنے کے الفاظ وارد نہیں ہوئے۔

قرآن میں وارد مزید مثالوں پر غور فرمائیں: قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَصْبَحَ مَاؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَأْتِيكُمْ بِمَاءٍ مَعِينٍ ﴿۳۰ الملك﴾

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَلَكَهُ يَنَابِيعَ فِي الْأَرْضِ ﴿۲۱ الزمر﴾

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَنَهَرٍ ﴿۵۴ القمر﴾

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ﴿۴۵ الحجر﴾

وَجَعَلْنَا فِيهَا جَنَّاتٍ مِنْ نَخِيلٍ وَأَعْنَابٍ وَفَجَّرْنَا فِيهَا مِنَ الْعُيُونِ ﴿۳۴ يس﴾

أَوْ تَكُونَ لَكَ جَنَّةٌ مِنْ نَخِيلٍ وَعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْأَنْهَارَ خِلَالَهَا تَفْجِيرًا ﴿۹۱ الإسراء﴾

عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللَّهِ يُفَجِّرُونَهَا تَفْجِيرًا ﴿۶ الانسان﴾

فِيهِمَا عَيْنَانِ نَضَّاخَتَانِ ﴿۶۶ الرحمن﴾

عَيْنًا فِيهَا تُسَمَّى سَلْسَبِيلًا ﴿۱۸ الانسان﴾

الغرض قرآن اور لغوی خصوصیت کی بنا پر ینبوع سطح زمین میں جمع شدہ بارش کے اس پانی کو کہتے ہیں جو زمین سے پھوٹ کر بشکل چشمہ بہتا ہے۔ جبکہ عین پانی کی اس بھاری مقدار کو کہا جاتا ہے جو زمین کی گہرائی میں بہتا ہے، ہاں جب یہی پانی پہاڑوں اور چٹانوں سے پھوٹ کر ندی نالوں اور نہروں کی شکل میں بہتا

ہے تو اس پر بھی مجازاً عین ہی کا اطلاق ہوتا ہے۔

جب زمین کی گہرائی میں موجود یہ پانی سطح زمین پر نکل کر بہتا ہے تو اسے ”عَيۡنٌ جَارِيَةٌ“ کہا جاتا ہے، جب یہی پانی نہایت تیزی کے ساتھ بہتا ہو تو اسے عَيۡنًا فِيهَا تُسَمّٰى سَلۡسَبِيلًا کہتے ہیں، جب یہ پانی سینکڑوں اور ہزاروں میل تک بہتا چلا جائے تو اسے نہر کہا جاتا ہے، جب یہ پانی حرارت وگرمی کے ساتھ نکلے تو اسے عَيۡنٍ آنِيَةٍ کہا جاتا ہے، جب چشمہ کا یہ پانی فوارے کی شکل میں اچھل اچھل کر نکلتا ہے تو اسے عَيۡنَانِ نَضَّاخَتَانِ کہتے ہیں، جب یہ پانی چٹانوں اور زمین کو چیر کر بھاری مقدار میں نکالا جاتا ہے تو اس وقت وَفَجَّرۡنَا الۡأَرۡضَ عُيُونًا فَالۡتَقَى الۡمَاءُ عَلٰى أَمۡرٍ قَدۡ قُدِرَ اور يُفَجِّرُونَهَا تَفۡجِيرًا بولا جاتا ہے،، جب یہ پانی نہایت گہرائی میں ہو تو اسے مَاءٍ مَعِين کہتے ہیں، اور جب زمین کی اندرونی تہہ میں موجود اسی پانی کی اوپری سطح ختم ہو کر جوش وخروش کے ساتھ بہتا نظر آئے تو اسے ” عَيۡنٍ حَمِئَةٍ “ کہتے ہیں۔

(ینبوع کی مزید وضاحت یاجوج وماجوج کے باب میں ملاحظہ فرمائیں)

کیا ہے عَيۡنٌ حَمِئَةٌ؟

حَمِئَةٌ: حَمِئَة حمِئ یحمأ، حمأ وحمأۃ سے صفت مشبہ کا صیغہ ہے ۔

حمِئ البئر یحمأ حمأ (باب سمع یسمع) کنویں کا بدبودار کالی مٹی والا ہونا۔

حمئ البئر، یحمأ حمأ (باب فتح یفتح) کنویں سے کالی بدبودار مٹی نکالنا۔

احمأت البئر (باب افعال) کنویں میں کالی بدبودار مٹی ڈالنا۔

الحمأ والحمأة: کیچڑ، کالی بدبودار مٹی

چنانچہ اسی معنی کے پیشِ نظر تمام اہلِ معاجم وتفسیر نے عین حَمِئَة کا معنی بھی صارت ذات حمأة کیا ہے ۔ یعنی بدبودار کالی مٹی والا چشمہ ۔ ملاحظہ فرمائیں۔

وَجَدَها أی الشمس تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ حَمِئَةٍ أی ذات حمأة وهی الطين الأسود من حمئت البئر تحمأ حمأ إذا كثرت حمأتها. روح المعانی

وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ حَمِئَةٍ : ذات حمأة من حمئت البئر إذا صارت فيها الحمأة. تفسير نسفی

"حمئة" أی كثيرة الحمأة وهی الطينة السوداء، تقول: حمات البئر حمأ (بالتسكين) إذا نزعت حماتها. وحميت البئر حمأ (بالتحريك) كثرت حماتها. القرطبی

صرف اتنا ہی نہیں بلکہ تاج العروس، لسان العرب اور المعجم الوسیط جیسی قابلِ اعتماد عربی لغات نے بھی تخلیقِ انسان کی ترتیب بتلانے والی آیت ''ولقد خلقنا الانسان من صلصال من حمأ مسنون میں وارد ''حمأ'' کو بمعنی طین اسود ثابت کرنے کے لئے بھی مذکورہ بالا آیت کو ہی بطور شاہد پیش کیا ہے۔

لیکن کیا ''حمئ البئر'' کا ترجمہ ''کنویں کا بدبودار کالی مٹی والا ہونا'' درست ہے؟ اگر درست ہے تو کیا ''العین'' کو ''البئر'' پر قیاس کرنا صحیح ہے؟

ماقبل میں لفظ ینبوع اور عین کی تشریح کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہو سکتا ہے ینبوع میں کبھی کہیں کیچڑ جمع ہو جائے لیکن کیا عین میں کسی نے کہیں کیچڑ دیکھا ہے؟

ہرگز نہیں ! کبھی بھی عین یعنی چٹانوں کی گہرائیوں سے نکل کر تیزی بہنے والے بڑے چشموں میں بدبودار کالی مٹی والا کیچڑ جمع ہونے کا امکان نہیں۔ تو پھر ''عین حَمِئة '' کا مطلب و معنی کیا ہے؟

دراصل حمئ البئر کا اصلی معنی'' بدبودار کالی مٹی والا ہونا'' کرنا صحیح نہیں، البتہ'' کیچڑ والا ہونا'' کیا جا سکتا ہے، وہ بھی مجازاً۔ اسکی وجوہات درج ذیل ہیں۔

ایک: اہل لغت کو جو سب سے بڑی غلط فہمی ہوئی وہ الحمأة کو حمئ یحمأ کا مادہ سمجھ لینا ہے، حمئ البئر کا معنی (ذات حمأة ای الطین الاسود المنتن) ''بدبودار کالی مٹی والا ہونا'' جو کیا گیا ہے وہ الحمأة کو بنیاد بنا کر ہی کیا ہی گیا ہے، حالانکہ الحمأة نہ مصدر ہے اور نہ اسم مصدر تو پھر یہ حمئ یحمأ کے لئے مادہ کیسے بن سکتا ہے؟ اتحاد حروف اصلیہ سے معنی کا متحد ہونا ضروری نہیں۔

دو : چلو مان لیتے ہیں کہ حمئ البئر کا معنی ذات حمأة ای الطین الاسود المنتن کرنا درست ہے، پھر بھی ''العین '' کو'' البئر '' پر قیاس کرنا درست نہیں، کیونکہ عین میں بدبودار کالی مٹی کا تصور ممکن ہی نہیں، چنانچہ کلام عرب کی تاریخ میں ایک بھی ایسی مثال پیش نہیں کی جا سکتی جہاں عین کے ساتھ حمأ بمعنی کیچڑ کا معنی وابستہ کیا گیا ہو۔

تین : '' حَمِئة ''صفت مشبہ کا صیغہ ہے، صفت مشبہ کسی چیز کی ہیئت و طبیعت میں واقع عارضی یا دائمی کیفیت وصفت پر دلالت کرتا ہے جیسے کدر، عطشان، جوعان، کریم، شریف۔ یہ سب صفت مشبہ کے صیغے ہیں، ان تمام

مثالوں میں وجود اپنی جگہ برقرار ہے اوران میں عارضی یا دائمی صفات طاری ہوئی ہیں جبکہ ''البئر حمئ'' یا ''عین حَمِئة'' کا ترجمہ اگر ذات حمأۃ یعنی ''کنویں یا چشمے کا بدبودار کالی مٹی والا ہونا'' کیا جائے تو اس صورت میں ہیئت اور وجود ہی بدل جاتا ہے کیونکہ کسی پانی والی جگہ میں کالی اور بدبودار مٹی اسی وقت پیدا ہوسکتی ہے جب پانی بالکل خشک ہونے کے قریب ہو یا خشک ہوچکا ہو۔ایسی حالتوں پر صیرورت کا اطلاق تو ہوسکتا ہے لیکن صفت مشبہ کا نہیں۔

تو پھر عین حَمِئة کا صحیح مطلب کیا ہے؟

اس کے لئے ہمیں ''حمئ'' کا اصل معنی جاننا ہوگا۔

کلام عرب اور معاجم میں کہیں بھی مفرد لفظ ''حمئ'' کا معنی لکھا نظر نہیں آتا بلکہ ''حمئ'' کے ساتھ تقریباً چار قسم کے فاعل لگے نظر آتے ہیں۔

حمئ البئر : کنواں کیچڑ والا ہوگیا

حمئ زید علی بکر : زید بکر پر برانگیختہ ہوگیا

رجل حمئ العین : وہ شخص جس کی آنکھ میں شدید تکلیف ہو

عین حمئة : (جو قرآن میں مذکور ہے)

اب سوال یہ ہے کہ ان تمام جملوں میں ''حمئ'' کا معنی مختلف ہے تو ان میں اصل معنی کیا ہے؟

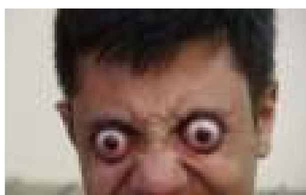
لغت عرب میں فاعل اور صلات کے تنوع سے فعل کے معانی کا اختلاف و تنوع ایک اصولی اور عام بات ہے، لیکن قواعد لغت عربی کے مطابق جس کسی فعل کا

معنی صلات اور فاعل کے تنوع سے بدل جائے پھر بھی ان میں ایک قدر مشترک معنی ضرور موجود ہوتا ہے جو کہ فعل کا حقیقی معنی کہلاتا ہے۔ مثلا ''رقد، یرقد'' جس کا معنی ہے سونا۔ جب اس کا فاعل ''السوق'' ہو تو اس کا ترجمہ ہوگا بازار کا مندا ہو جانا۔

جب فاعل ''الحر'' آئے تو ترجمہ ہوگا گرمی کم ہو جانا۔

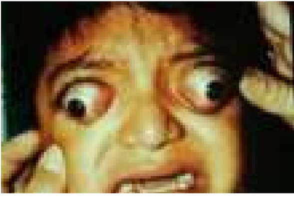
جب اسکا صلہ ''عن الامر'' آئے تو اس کا ترجمہ ہوگا کسی کام سے غافل ہو جانا۔

مذکورہ مثالوں پر غور کیجیے! فاعل کے بدلنے سے معانی میں تفاوت واقع ہو چکا ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو ان تمام میں ایک معنی قدر مشترک کے طور پر موجود ہے اور وہ ہے ''معمول کے فرائض اور سرگرمی کا معطل ہو جانا''، ٹھیک اسی طرح لفظ ''حمئ'' سے بنے جملوں پر غور کیجیے یہاں بھی معانی کے تفاوت کے باوجود ایک معنی سب میں موجود ہے اور وہ ہے ''کنواں، چشمہ اور آنکھ جیسی کسی گہری چیز کے آس پاس بنی حفاظتی آڑ یا سطح کا اندر کی طرف دھنس جانا''۔



حمئ زید علی فلان (زید کسی پر برانگیختہ ہوگیا) یہ اس وقت بولا جائے گا جب کوئی غصہ کی حالت میں ایسا مشتعل ہو جائے کہ آنکھ پلکوں سے باہر کی طرف چلی آئے۔ اسی کو ہمارے محاورے میں کہتے ہیں۔ ''آنکھیں نکالنا'' یا ''آنکھیں پھاڑ کے دیکھنا''

رجل حمئ العین (ایسا شخص جس کی آنکھ میں شدید تکلیف ہو) یہ ایسے شخص کے



لئے بولا جائیگا جو آنکھ کی ایسی بیماری میں مبتلا ہو جائے جس میں آنکھ کا ڈورا پلکوں سے باہر آ جاتا ہے۔

دیکھیے ان دونوں مثالوں میں آنکھوں کا ڈورا باہر کی طرف آ جاتا ہے جبکہ آنکھوں کی حفاظت کرنے والی پلکیں کناروں سے اندر کی طرف دھنس جاتی ہیں۔



حمئ البئر (کنواں کیچڑ والا ہوگیا) یہ اس وقت بولا جائیگا جب کنویں کے آس پاس بنی مٹی کی دیوار پانی میں گر جائے (مٹی کی دیوار کنویں میں گرنے سے پانی کیچڑ والا ہو جائیگا۔فصار البئر ذا حماۃ۔)

ٹھیک اسی طرح حمئت العین کا معنی ہوگا ایسا چشمہ جس کی اوپری سطح یا اطراف میں کناروں کی شکل میں موجود آڑ ختم ہو کر چشمہ میں گر گئی ہو۔

الغرض ''حمئ'' کا حقیقی معنی ہے ''کنواں، چشمہ اور آنکھ جیسی کسی گہری چیز کے آس پاس بنی حفاظتی آڑ یا سطح کا اندر کی طرف دھنس جانا''۔ لہٰذا عین حَمِئة کا معنی ہوگا ایسا چشمہ جس کے اوپر یا آس پاس بشکل زمین یا برف موجود سطح یا آڑ کا چشمہ میں مستقل طور پر گرتے رہنا۔''حَمِئة'' صفت مشبہ کا صیغہ ہونے کی وجہ سے دوام کا معنی کرتے ہوئے ''ہمیشہ گرتے رہنے'' کا معنی کیا گیا ہے۔

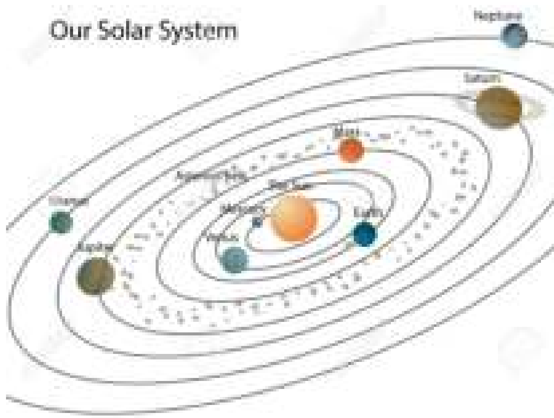
(''عین حَمِئة'' کے مفہوم کو اردو میں تعبیر کرنے کے لئے ہمارے پاس معیاری الفاظ نہ ہونے کی وجہ سے اس قسم کے چشمہ کو فی الحال '' چشمۂ واشگاف'' سے تعبیر جائیگا۔)

''چشمہ واشگاف'' کہاں واقع ہے؟

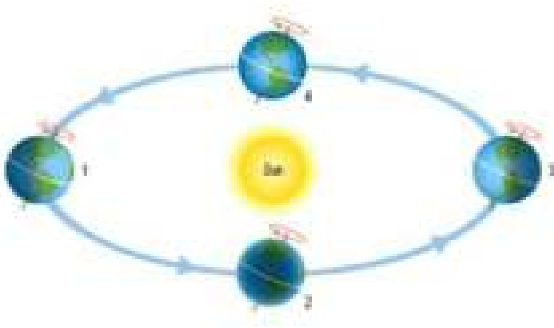
آیئے اب جانتے ہیں کہ وہ چشمہ واشگاف کہاں ہے جہاں سورج مسلسل کئی دنوں تک نظر نہیں آتا بلکہ لمبی مدت تک وہاں متواتر رات ہی رہتی ہے؟

لیکن مزید وضاحت سے پہلے آیئے ہم علم جغرافیہ کی کچھ ابتدائی باتوں کو سمجھ لیتے ہیں۔

زمین نظام شمسی کا تیسرا سیارہ ہے، جو اپنے محور پر گھومنے کے ساتھ ساتھ سورج کے گرد بھی گردش کرتا ہے۔ زمین سورج کے گرد جس فرضی دائرے پر گردش



کرتی ہے اسے ''مدار ارض'' (Orbit) کہتے ہیں جبکہ زمین کے اندر سے ایک سرے سے دوسرے سرے کی جانب جانے والے اس فرضی خط مستقیم کو ''محور'' کہتے ہیں جس کے ارد گرد زمین لٹو کی



طرح گھومتی ہے، محور کا شمالی سرا قطب شمالی کہلاتا ہے جبکہ جنوبی سرا قطب جنوبی۔

وقت اور جگہ کے تعین کے لئے سطح زمین کو طولاً و عرضاً کچھ فرضی خطوط کے ذریعہ تقسیم کیا گیا ہے۔ ان خطوط کو خطوط طول بلد و خطوط عرض بلد کہا جاتا ہے۔

عرض بلد: سطح زمین پر قطب شمالی و جنوبی کے ٹھیک بیچ میں ایک خط کھینچا گیا ہے جسے خط استواء کہا جاتا ہے۔ خط استواء سے قطبین تک شمالاً و جنوباً مختلف فاصلوں پر جو خط کھینچے جاتے ہیں انہیں خطوط عرض بلد اور انکے درمیانی فاصلہ کو عرض بلد کہا جاتا ہے، خط استواء کا عرض بلد صفر ہے، جبکہ قطب شمالی و قطب جنوبی علی الترتیب ۹۰ درجہ شمالی و ۹۰ درجہ جنوبی عرض بلد مانا جاتا ہے۔



طول بلد: قطبین کے درمیان عموداً قطب شمالی سے قطب جنوبی کی جانب خط استواء کو قطع کرتے ہوئے کھینچے گئے فرضی خطوط کو طول بلد کہا جاتا ہے۔ جس طرح خط استواء کو صفر درجہ عرض بلد پر واقع مانا جاتا ہے اسی طرح انگلستان کے مقام گرینویچ سے گذرنے والے طول بلد کو صفر درجہ طول بلد پر واقع مانا جاتا ہے ۔ اس خط طول البلد کو نصف النہار اولی (Prime Meridian) کہا جاتا ہے، اس خط نصف النہار اولی سے مشرق میں ۱۸۰ اور مغرب



میں ۱۸۰ خطوط کھینچے گئے ہیں، شرقاً وغرباً ۱۸۰ درجہ پر جہاں دونوں طرف کے خط ایک دوسرے پر جڑتے ہیں انہیں بین الاقوامی خط تاریخ کہا جاتا ہے۔

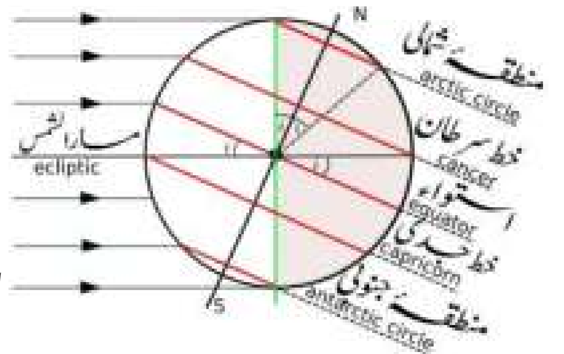
جغرافیائی منطقہ: آب وہوا کے اختلاف کے مدنظر سطح ارضی کو عرضاً پانچ منطقوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ۱ منطقہ باردہ شمالی (North Frigid Zone) ۲ منطقہ باردہ جنوبی (South Frigid Zone) ۳ منطقہ معتدلہ شمالی (North Temperat Zone) ۴ منطقہ معتدلہ جنوبی (South Temperate Zone) ۵ منطقہ حارہ (Tropical Zone)۔

منطقہ باردہ شمالی: یہ علاقہ ۹۰ درجے عرض بلد شمال (یعنی قطب شمالی) اور ۶۶ درجے ۳۳ عرض بلد شمال (یعنی دائرہ قطب شمالی) کے درمیان واقع ہے۔

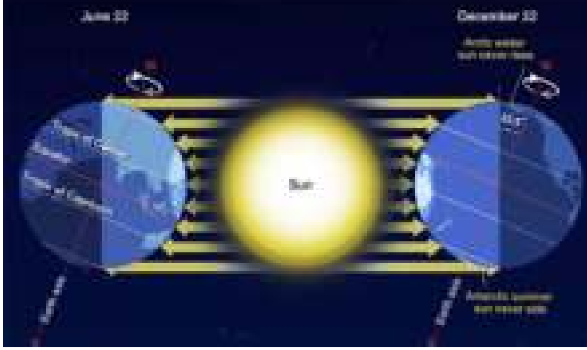
منطقہ باردہ جنوبی: یہ علاقہ ۹۰ درجہ عرض بلد جنوب (یعنی قطب جنوبی) اور ۶۶ درجے ۳۳ عرض بلد جنوب (دائرہ قطب جنوبی) کے درمیان واقع ہے۔

ان دونوں منطقوں کا اکثر حصہ ہزاروں کلومیٹر لمبی چوڑی برف کی موٹی موٹی تہوں سے ڈھنکا ہوا ہے۔ ان منطقوں کو (Poral Region) بھی کہا جاتا ہے یعنی جہاں کم وبیش چھ چھ مہینے تک کے متواتر رات اور دن پائے جاتے ہیں۔

قرآن نے واقعہ ذوالقرنین میں اول الذکر کو مطلع الشمس سے تعبیر کیا ہے اور ثانی الذکر کو مغرب الشمس سے۔



اب آپ سمجھ چکے ہونگے کہ چشمہ ٔ واشگاف منطقہ باردہ شمالی یا منطقہ باردہ جنوبی میں سے کسی ایک مقام پر واقع ہوسکتا ہے، اس لئے کہ یہی دو علاقے ایسے ہیں جہاں رات اور دن کا غیر معمولی دورانیہ پایا جاتا ہے۔



ہاں منطقہ باردہ جنوبی ہی وہ علاقہ ہے جہاں چشمہ ٔ واشگاف واقع ہے۔ اور یہ چشمہ کچھ اور نہیں بلکہ ہزاروں کلو میٹر پر مشتمل اور تیزی سے بہتا وہی پانی ہے جسے دنیا چوتھا بڑا سمندر یعنی بحر منجمد جنوبی کہتی ہے۔

ہوسکتا ہے بعض لوگوں کو یہ بات مضحکہ خیز بھی معلوم ہورہی ہو، لیکن تھوڑا انتظار کیجیے۔

جغرافیہ دانوں کے مطابق روئے زمین پر پانچ سمندر ہیں۔ بحرالکاہل، بحر اوقیانوس، بحر ہند، بحر منجمد جنوبی اور بحر منجمد شمالی۔

بحر منجمد جنوبی براعظم انٹارکٹکا کے اردگرد واقع ہے، اس کی بیرونی سرحد کسی بری علاقے سے ملنے کی بجائے بحرالکاہل، بحر اوقیانوس اور بحر ہند سے ملتی ہے۔ اس کا کل رقبہ ۲۰۳۲۷۰۰۰ مربع کلومٹر ہے، رقبہ کے اعتبار سے یہ چوتھے نمبر پر ہے۔ اس کی گہرائی ۴ سے ۵ ہزار میٹر کے درمیان ہے، سب سے زیادہ گہرائی ۷ ہزار ۲۳۵ میٹر ہے۔



اہل علم بحر منجمد جنوبی کہلائے جانے والے اس پانی کے متعلق لمبی مدت تک فیصلہ نہیں کر پائے کہ آیا پانی کا یہ علاقہ بحر الکاہل ، بحر اوقیانوس اور بحر ہند کا ہی حصہ ہے یا اسکی کوئی الگ حیثیت ہے، اگر اس کی مستقل شناخت ہے تو پھر اسے اوشن یعنی بحر کہا جائے یا کچھ اور؟ چنانچہ لمبے عرصے کے بحث ومباحثہ کے بعد آخر کار ۲۰۰۰ء میں بین الاقوامی تنظیم برائے آبی جغرافیہ (آئی ایچ او) نے اسے مستقل بحر کے طور پر تسلیم کرلیا، پہلے انگریزی میں اسے انٹارکٹکا اوشن (Antarctica Ocean) کہا جاتا تھا لیکن ۲۰۰۰ء میں اس کا نام بدل کر سدھرن اوشن (Southern Ocean) رکھ دیا گیا۔

براعظم انٹارکٹا کے اردگرد واقع جس پانی کو مستقل حیثیت دیکر چوتھے بحر کے طور پر تسلیم کرلیا گیا ہے، کیا اسے فی الواقع بحر کہنا درست ہے یا پھر اس کے لئے زیادہ موزوں لفظ العین ہے؟

ینبوع اور عین کی بحث کے دوران یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ عین پانی کی اس بھاری مقدار کو کہا جاتا ہے جو زمین کی گہرائی میں موجود ہے، جب اس پانی پر موجود سطح کسی طرح ختم ہوجائے تو اسے عین حمئۃ کہتے ہیں۔

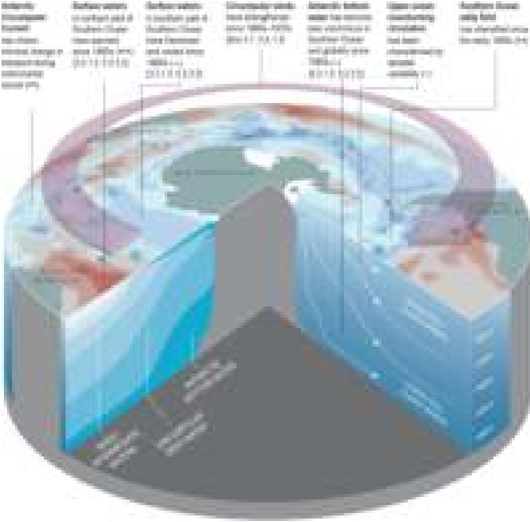
اب سوال یہ ہے کہ کیا زیر زمین اس قدر پانی موجود ہے کہ وہ ایک سمندر کی حیثیت رکھتا ہو؟

زمین کے اندر کس قدر پانی ہے اس کا اندازہ طوفان نوح کا حال بیان کرتی قرآن کی اس آیت سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے سے فرمایا تھا: يَا بُنَيَّ ارْكَب مَّعَنَا وَلاَ تَكُن مَّعَ الْكَافِرِين۔ (اے بیٹے ہمارے ساتھ سوار ہو جا اور کافروں میں سے مت بن) تو بیٹے نے کہا: قَالَ سَآوِي إِلَى جَبَلٍ يَعْصِمُنِي مِنَ الْمَاء کہ میں کسی بلند پہاڑ پر چڑھ جاؤنگا جو مجھے بچا لیگا۔ تو نوح علیہ السلام نے جواب دیا قَالَ لاَ عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللّهِ إِلاَّ مَن رَّحِمَ کہ آج اللہ کے حکم سے کوئی بچانے والا نہیں ہے۔

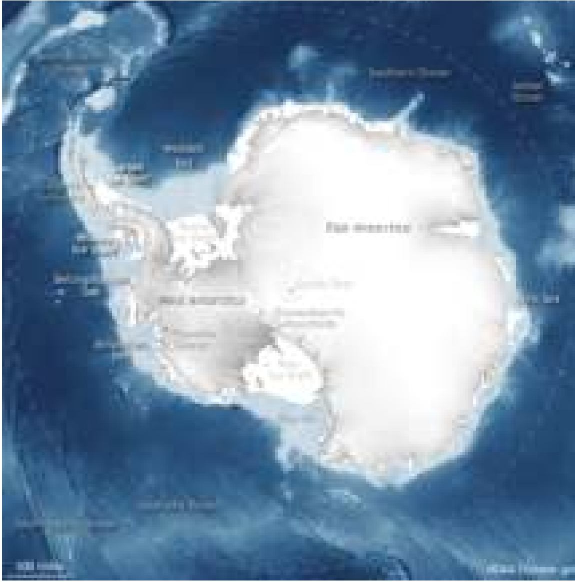
پہاڑوں کو بھی غرقاب کر دینے والا اس قسم کا طوفان صرف سمندروں سے اٹھنے والے بارش کے پانی اور بشکل ینبوع بہنے والے چشموں سے ممکن نہیں ہوا بلکہ اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے زمین کی گہرائی میں بہتے چشموں کو بھی پھوڑ نکالا تھا تبھی جا کر ایسا ہلاکت خیز طوفان ممکن ہوا۔ چنانچہ فرمایا: فَفَتَحْنَا أَبْوَابَ السَّمَاء بِمَاء مُّنْهَمِرٍ (۱۱) وَفَجَّرْنَا الْأَرْضَ عُيُونًا فَالْتَقَى الْمَاء عَلَى أَمْرٍ قَدْ قُدِرَ (۱۲)

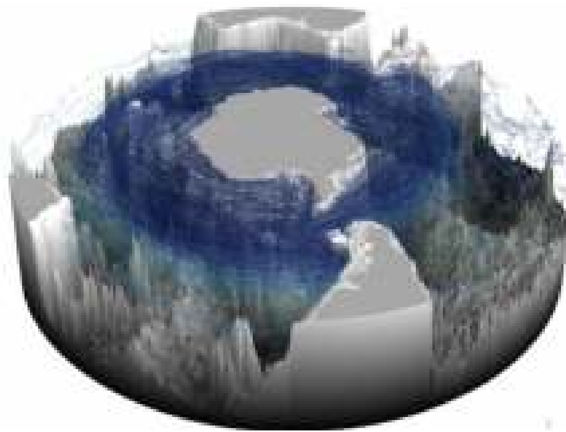
دوسری جانب اب تک سائنسداں دنیا کو یہی بات باور کراتے رہے کہ زمین فلاں فلاں قسم کے طبقات پر مشتمل ہے، جس میں پہلے طبقہ کے کچھ حصہ میں بارش کا پانی جمع ہوتا رہتا ہے اور وہی پانی چشموں کی صورت میں باہر نکلتا رہتا ہے ۔ان کے نزدیک عین اور ینبوع جیسی الگ الگ حیثیتوں کا کوئی تصور نہیں تھا، لیکن

بین الاقوامی سائنسی جریدے ''نیچر'' کی ۲۰۱۴ میں شائع کی گئی ایک تحقیق کے مطابق زمین کی گہرائی میں سطح زمین پر موجود سمندروں سے بھی زیادہ پانی موجود ہونے کا امکان ہے۔



یہ پانی زیر زمین سینکڑوں اور ہزاروں کلومیٹر کے رقبہ پر پھیلا ہوا ہو سکتا ہے۔ انہی میں سے ایک چشمہ منطقۂ باردہ جنوبی میں واقع وہی پانی ہے جسے سائنسداں ''سدھرن اوشن'' کے نام سے پکارتے ہیں۔جس طرح سطح زمین نے ان چشموں کو ڈھانپ رکھا ہے اسی طرح سدھرن اوشن بھی کبھی برف کی موٹی تہہ کے نیچے ہی بہتا





ہوگا۔ حیرت کی انتہا نہیں کہ آج بھی سطح اور کناروں کی برف کے کئی کئی میٹر لمبے چوڑے ٹکڑے ٹوٹ ٹوٹ کر چشمہ میں شامل ہوتے جا رہے ہیں۔ جس کسی کو ''وجدھا تغرب فی عین حمئۃ'' کا بولتا ثبوت چاہیے وہ جزیرہ انٹارکٹا کے آس پاس کے پانی میں مسلسل پگھل کر شامل ہونے والی برف کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔





چشمۂ وا شگاف سے گھرا جزیرۂ انٹارکٹا ایک کروڑ بیالیس لاکھ مربع کلو میٹر پر پھیلا ہوا ہے، اس پورے رقبہ کا

صرف دو فی صد حصہ چھوڑ کر ۹۸ فی صد علاقہ پر برف کی موٹی تہہ جمی ہوئی ہے، اس برفیلی تہہ کی اوسط موٹائی تقریباً سات ہزار فٹ ہے، جبکہ سب سے زیادہ موٹی پرت سولہ ہزار فٹ ہے۔ چشمہ واشگاف بھی یقیناً اسی طرح کی کم و بیش موٹی برف کی پرت سے ڈھکا ہونا چاہیے تھا جو آہستہ آہستہ پگھل کر ختم ہوتی چلی گئی اور آج بھی پگھلتی جا رہی ہے۔

یہ پانی برفانی تودوں، خطرناک طوفانوں اور بلند و بالا موجوں کی وجہ سے ایک منفرد مقام رکھتا ہے، اسی وجہ سے اسے روفیسٹ واٹر (Roughest Water) یعنی ناہموار پانی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ پانی کی ایسی ناہمواری اور بہاؤ کی تیزی کی کئی توجیہات پیش کی گئی ہیں لیکن پھر بھی ماہرین بحریات اس کی وجوہات تلاش کرنے پہ لگے ہوئے ہیں کہ آخر کس بنا پر یہ پانی اس قدر تیزی و تندی کے ساتھ بہتا ہے۔ ظاہر سی بات ہے کسی بھی دیگر سمندر کے پانی میں یہ خصوصیت نہیں پائی جاتی، درحقیقت جن عوامل و طاقت کے نتیجہ میں چشمہ کا پانی زیر زمین سے نکل کر سطح ارض تک آ کر بہنے لگتا ہے اسی طاقت اور عوامل کی بنا پر منطقۂ باردہ جنوبی کا یہ پانی اچھل اچھل کر پوری طاقت سے جزیرہ کے گرد گھومتا رہتا ہے۔

اس چشمہ کا خطرناک ترین علاقہ وہ ہے جو جنوبی امریکہ کے کیپ ہارن (Cape Horn) اور انٹارکٹا کے ساؤتھ شیٹلینڈ (South Shetland Island) کے بیچ میں واقع ہے۔ یہ علاقہ ''ڈریک پاسیج (Drake Passage) کے نام سے مشہور ہے۔ دور حاضر کی جدید تکنک سے آراستہ





ہونے کے باوجود برفانی تودوں ،ہواؤں کے تیز طوفانوں اور بلندو بالاموجوں کی وجہ سے اس علاقہ کو پار کرنا جہازوں کے لئے بڑا کٹھن مسئلہ ہوتا ہے ۔سب سے بڑی ۷۸ فٹ بلند موج کا ریکارڈ بھی اسی پانی کے نام جاتا ہے۔

معلوم تاریخ کے مطابق اس علاقہ میں اب تک ۸۰۰ جہاز اور ۱۰۰۰۰ سے زائد لوگ ہلاک ہو چکے ہیں۔

اس ’’چشمۂ واشگاف‘‘ کا سب سے زیادہ ٹھاٹھیں مارتا یہ طوفانی علاقہ جنوبی امریکہ کے ساحل سے ملتا ہے ۔جنوبی امریکہ کی ریاست ’’ارجنٹینا اور چلی‘‘ کا جنوبی علاقہ ہی وہ جگہ ہے جس میں ذوالقرنین نے ایک قوم سے مل کر انہیں اللہ کا پیغام سنایا تھا کیونکہ آبادی والے علاقوں میں زمین کا یہی علاقہ ایسا ہے جس پر’’ چشمۂ واشگاف‘‘ سے قریب ہونے کا اطلاق کیا جاسکے۔

الحاصل ذوالقرنین جس مغرب الشّمس میں تشریف لے گئے اس کی جو جو امتیازی نشانیاں قرآن نے بتلائی ہیں وہ تمام روئے زمین کے پانیوں میں صرف

اسی چشمہ میں پائی جاتی ہیں۔

نمبرایک : یہ پانی ایک چشمہ کی حیثیت رکھتا ہے کوئی سمندر نہیں، اسکے اطراف اور سطح کی برف ٹوٹ ٹوٹ کر چشمہ میں شامل ہوتے جانے کا یہ عمل اسی طرح آج بھی جاری ہے جیسا کہ ہزاروں سال پہلے ذوالقرنین نے دیکھا تھا۔

نمبردو : یہی وہ چشمہ ہے جہاں مسلسل چوبیس گھنٹوں کی رات پائی جاتی ہے، تعجب کی بات یہ ہے کہ پولار ریجن کی حد جہاں سے شروع ہوتی ہے اس کے اندر سے ہی اس چشمہ کی حد شروع ہوتی ہے۔

نمبرتین: اس چشمہ کے بیچ جزیرہ ہونے کے باوجود یہاں کوئی آبادی نہیں کیونکہ اس کا اکثر حصہ برف کی تہہ سے ڈھکا ہوا ہے اور اس کا درجہ حرارت منفی ۸۹ تک ریکارڈ کیا ہے۔ البتہ اس چشمہ کے باہر ایک ہی ایسی جگہ ہے جسے قریب ترین انسانی آبادی والا علاقہ کہا جاسکے، اور وہ ہے جنوبی امریکی ریاست ’’ارجنٹینا اور چلی‘‘ کا جنوبی علاقہ۔

نمبر چار: دور جدید کی ٹکنالوجی کے باوجود آج بھی اس پانی میں سوچ سمجھ کر سفر کرنا پڑتا ہے کیونکہ یہ دنیا کا روفیسٹ واٹر ہے، اس جیسا ٹھاٹھیں مارتا پانی کسی اور سمندر میں نہیں پایا جاتا۔ نیز اس پانی پر



تیزی سے چلنے والے ہواؤں کے طوفانوں کے علاوہ جہازوں کو توڑ دینے والی برف کی موٹی موٹی چٹانیں بھی پگھل کر گردش کرتی رہتی ہیں۔ اب اندازہ لگائیں کہ کیا ہزاروں سال پہلے بادبانی کشتیوں کے ذریعہ کسی ایسے پانی کا سفر ممکن ہے جہاں ہڈیوں کا گودہ تک جمانے دینے والی ٹھنڈ کے علاوہ تیز ہواؤں کے طوفان جاری ہوں، پانی کی تیز لہروں کے علاوہ جہازوں کو توڑ دینے والی برف کی چٹانیں بھی گردش میں ہوں۔ ان سوالوں کو ذہن میں رکھ کر قرآن کی اس آیت کو سمجھیے جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ ''ہم نے ذوالقرنین کو ہر قسم کی سواری اور وسائل حمل و نقل عطا کئے تھے''۔

سردست یہ بات بھی بتاتے چلیں کہ سائنسدانوں کے مطابق منطقۂ باردہ جنوبی کا یہ علاقہ گزشتہ دو سو برس پہلے ہی انسان کی دسترس میں آیا ہے جبکہ ذوالقرنین ہزاروں سال پہلے وہاں پہنچ چکے تھے۔

''وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ حَمِئَةٍ'' میں ''وَجَدَهَا'' کا لفظ بتلاتا ہے کہ اس پانی کے عین یعنی چشمہ ہونے کا مشاہدہ خود ذوالقرنین کا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ذوالقرنین نے صرف پانی کے اوپر ہی سفر نہیں کیا بلکہ پانی کی تہہ تک بھی رسائی حاصل کی تھی، کیونکہ پانی کی تہہ میں جائے بغیر یہ فیصلہ کرنا دشوار ہوگا کہ یہ چشمہ ہے یا نہیں۔ اندازہ لگائیں کہ آخر ذوالقرنین کے پاس کس قسم کی ٹکنالوجی سے آراستہ سواری ہوگی کہ ایسے خطرناک ترین پانی میں جا کر اس قسم کا حتمی مشاہدہ کیا جا سکے۔ مزید وضاحت ان شاء اللہ اگلے صفحات میں ہوگی۔

اگر سائنس داں اسے چشمہ کی حیثیت سے تسلیم کر لیتے ہیں تو وہ بہت سی گتھیاں سلجھ سکتی ہیں جن میں وہ الجھے ہوئے ہیں۔ اختلافات حل ہونے کے علاوہ معیاری نظریات بھی قائم کئے جا سکتے ہیں۔

آگے بڑھنے سے پہلے اتنا عرض کرتے چلیں کہ ماقبل میں آیت کی وضاحت کے بعد مخالفین اسلام کا وہ مشہور اعتراض چکنا چور ہو جاتا ہے کہ ''اگر قرآن اللہ کا کلام ہوتا تو اس میں یہ بات نہ کہی جاتی کہ سورج کیچڑ والے پانی کے چشمہ میں ڈوبتا ہے''۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ آیتوں کے غلط ترجموں کو بنیاد بنا کر قرآن کو انسانی کاوش ثابت کرنے کی کوشش کرنے والے مخالفین اسلام اپنی حق پرستی کا ثبوت دیتے ہوئے اس بات کا اعتراف کرتے ہیں یا نہیں کہ یہ قرآن کسی انسان کے بس کا نہیں بلکہ ایک زبردست علیم و خبیر ہستی کا کلام ہے۔

حَتَّىٰٓ إِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَوَجَدَ عِندَهَا قَوْمًا قُلْنَا يَـٰذَا الْقَرْنَيْنِ إِمَّآ أَن تُعَذِّبَ وَإِمَّآ أَن تَتَّخِذَ فِيهِمْ حُسْنًا ﴿٨٦﴾ قَالَ أَمَّا مَن ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهُۥ ثُمَّ يُرَدُّ إِلَىٰ رَبِّهِۦ فَيُعَذِّبُهُۥ عَذَابًا نُّكْرًا ﴿٨٧﴾ وَأَمَّا مَنْ ءَامَنَ وَعَمِلَ صَـٰلِحًا فَلَهُۥ جَزَآءً الْحُسْنَىٰ ۖ وَسَنَقُولُ لَهُۥ مِنْ أَمْرِنَا يُسْرًا ﴿٨٨﴾

ترجمہ: یہاں تک کہ جب وہ ایک ایسے مغرب میں پہنچا جہاں دیکھا کہ چشمۂ وا شگاف کے علاقہ میں سورج اپنے معمول کے مطابق نظر نہیں آتا (بلکہ کئی دنوں

تک بحالت غروب ہی رہتا ہے)۔ اس چشمہ کے قریب ایک قوم سے ملاقات ہوئی۔ ہم نے کہا اے ذوالقرنین (تیرے اختیار میں ہے) تو انہیں عذاب بھی دے سکتا ہے یا ان کے ساتھ اچھائی کا معاملہ بھی کر سکتا ہے۔ اس نے کہا کہ جو ظلم کریگا اسے ہم سزا دینگے، پھر وہ اپنے پروردگار کی طرف لوٹایا جائیگا تو وہ اسے اندوہناک عذاب دے گا۔ ہاں جو ایمان لاکر نیک کرے گا تو اسکے لئے بہترین بدلہ ہے اور ہم بھی اس کے ساتھ آسانی کا معاملہ کرینگے۔

مقام ثانی: منطقۂ باردہ شمالی

(North polar region)

ثُمَّ أَتْبَعَ سَبَبًا ﴿٨٩﴾ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلَىٰ قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَل لَّهُم مِّن دُونِهَا سِتْرًا ﴿٩٠﴾ كَذَٰلِكَ وَقَدْ أَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ﴿٩١﴾

پھر ذوالقرنین نے ایک سواری پکڑی۔ یہاں تک کہ جب وہ سورج کے طلوع ہونے کی ایک جگہ پہنچا تو وہاں سورج کو ایک قوم (کے افق) پر اس طرح مسلسل بحالت طلوع رہتے دیکھا کہ ان کے لیے ہم نے سورج سے ورے کوئی آڑ نہیں بنائی تھی۔

یہاں پر قرآن اشارے کنایہ میں نہیں بلکہ واضح الفاظ میں یہ بتلانا چاہتا ہے کہ ذوالقرنین جس علاقہ میں گئے وہاں سورج چوبیسوں گھنٹے افق ہی افق پر نظر

آتا تھا، یعنی خط استواء اور اس کے آس پاس کے علاقوں کی طرح چوبیس گھنٹوں کے دن رات کے اپنے معمول کے مطابق سورج عموداً سروں پر سے گذرتا ہوا غروب نہیں ہوتا تھا بلکہ اسکے برخلاف افق ہی افق پر دائیں سے بائیں چکر لگا تا ہوا نظر آتا تھا۔

مزید وضاحت سے پہلے مفسرین کے اقوال پر نظر ڈال لیتے ہیں ۔

مفسرین نے آیت کا مطلب بتلاتے ہوئے لکھا ہے کہ ذوالقرنین کی دوسری مہم ایران کے مشرق کی طرف تھی ، وہ فتوحات کرتا ہوا آگے بڑھا۔ یہاں تک کہ وہ ایسے مقام پر پہنچ گیا جہاں بالکل غیر متمدن لوگ بستے تھے۔ ''ان کے اور آفتاب کے درمیان آڑ نہیں تھی'' کا مطلب غالباً یہ ہے کہ وہ خانہ بدوش تھے اور تعمیر شدہ مکانات میں رہنے کے بجائے کھلے میدانوں میں زندگی گذارتے تھے،(تذکیر القرآن،مولانا وحید الدین خان)

یعنی وہ ممالک فتح کرتا ہوا مشرق کی جانب ایسے علاقے تک پہنچ گیا جہاں مہذب دنیا کی سرحد ختم ہوگئی تھی اور آگے ایسی وحشی قوموں کا علاقہ تھا جو عمارتیں بنانا تو درکنار خیمے بنانا تک نہیں جانتی تھیں۔ (تفہیم القرآن،مولانا ابوالاعلی مودودی)

تقریباً اردو عربی کے تمام مفسرین وشارحین قرآن نے وہی وضاحت کی ہے جو مذکورہ بالا دونوں حضرات نے پیش کی ہے،تقریباً سبھی نے مطلع الشمس کو انتہائے مشرق کے معنی میں لیا ہے،جس طرح مغرب الشّمس کو انتہائے مغرب کے معنی میں لیا گیا ہے۔اسی طرح لَمۡ نَجۡعَلۡ لَهُمۡ مِنۡ دُوۡنِهَا سِتۡرًا کی وضاحت

کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انتہائے مشرق میں پائی جانے والی قوم اتنی غیر متمدن تھی کہ گھر اور خیمے بھی بنانا نہیں جانتی تھی بلکہ کھلے آسمان تلے رہتی تھی، حتیٰ کہ بعض نے تو یہ لکھ دیا کہ وہ کپڑے پہننا بھی نہیں جانتی تھی۔

آیئے اب ان آیات کو لغوی تحلیل کے ذریعہ سمجھتے ہیں۔

وجدھا تطلع : مقام اول میں وضاحت ہو چکی ہے کہ ''وجد'' فعل یقین اپنے ما بعد آنے والے جملہ کو حال اور ذوالحال میں بدل کر حالیت میں امتداد کا معنی پیدا کر دیتا ہے، چنانچہ ''وجدھا تطلع'' کا معنی ہوگا: اس نے سورج کو مسلسل بحالت طلوع پایا۔ اب یہ تسلسل کتنا تھا، اسے آیت کے اگلے حصہ میں بیان کیا گیا ہے۔

ستراً : کسی بھی ڈھانپ دینے والی چیز کو ستر کہتے ہیں۔ مجازاً رات کے معنی میں بھی مستعمل ہے، کیونکہ رات بھی ڈھانپنے کا کام کرتی ہے۔ اسی لئے محاورہ عرب میں بولا جاتا ہے: **وَمَدَّ اللیلُ أَسْتَارَہُ . وأَمُدُّ إِلی اللہ یَدِی تَحْتَ سِتَارِ اللَّیْلِ.**

من دونہا : من دون کئی معانی میں مستعمل ہے، سیاق وسباق سے اسکے صحیح معنی کی تعیین ہوتی ہے، ''من دون'' کبھی دو چیزوں کے درمیان کے فاصلہ کو بتلاتا ہے، یہاں یہی معنی مقصود ہے۔ اگلے صفحات میں ان شاء اللہ اس پر مزید بحث کی جائیگی۔

لَمْ نَجْعَلْ لَهُمْ مِنْ دُونِهَا سِتْرًا ہم نے ان لوگوں کے لئے سورج سے ورے کسی آڑ (کے ذریعہ رات) نہیں بنائی تھی۔ گویا جس جگہ رات ہوتی ہے

وہاں لوگوں اور سورج کے بیچ کوئی ستر یعنی آڑ لائی جاتی ہے، اب ظاہر سی بات ہے کہ یہ آڑ خود زمین کے علاوہ کچھ اور نہیں ہو سکتی، یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ''لھم'' کا لفظ استعمال کیا۔ اگر ستر زمین کے علاوہ کوئی اور چیز ہوتی تو ''لھم'' کے بجائے ''للارض'' کہا جاتا۔

الغرض آیت کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح خط استوا اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں چوبیس گھنٹوں کے دوران دن رات بدلتے رہتے ہیں، زمین کا ایک حصہ سورج کے سامنے آتا جاتا ہے ٹھیک اسکے پیچھے والے حصے پر رات ہوتی جاتی ہے، اس طرح کا دورانیہ اس مطلع الشّمس میں نہیں تھا جہاں ذو القرنین تشریف لے گئے تھے بلکہ جتنے دنوں تک سورج چوبیسوں گھنٹے بحالت طلوع رہتا تھا اتنے دنوں تک تھوڑی دیر کے لئے بھی رات نہیں ہوتی تھی۔



قرآن میں جا بجا ایسی آیتیں موجود ہیں جو واضح طور پہ نظام شمسی کی پیدائش اور کائنات کے متعلق بہت سارے حقائق سے پردہ اٹھاتی ہیں۔ ان شاء اللہ کبھی ''فلکیات قرآن'' کے عنوان سے کسی تحریر کے ذریعہ اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کی جائیگی، جس میں ارض و سماء، نظام شمسی کی پیدائش، اجرام سماوی کی حقیقت، زمین کی محوری اور دوری گردش جیسی بہت سی باتوں کے علاوہ کائنات کی

پیدائش اور سماوات قرآنی کی حقیقت واضح کرنے کی کوشش کی جائیگی کہ ان کے متعلق سائنس کیا کہتی ہے، لوگوں نے دین و مذہب کے نام پر کیا کیا بولا ہے اور کائنات کا خالق قرآن کے ذریعہ کیا کہتا ہے۔ البتہ سر دست مذکورہ بالا آیت سے جو باتیں پتہ چلتی ہیں وہ کچھ اس طرح ہیں۔

لَمْ نَجْعَلْ لَهُمْ : ہم نے ان کے لئے کوئی آڑ نہیں بنائی تھی، یعنی سایہ نہیں بنایا تھا، یعنی رات نہیں رکھی تھی۔

لَمْ نَجْعَلْ لَهُمْ مِنْ دُونِهَا سِتْرًا : اس آیت سے واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ رات دن کی آمد و رفت زمین کے گرد سورج کی گردش کے نتیجہ میں نہیں ہوتی بلکہ سورج کے سامنے زمین کی گردش کا نتیجہ ہے۔ لوگ اور سورج کے بیچ ستر لانے کا یہی مطلب ہے کہ زمین کا ایک حصہ دوسرے حصہ کے لئے آڑ بنکر سایہ بناتا ہے اور سایہ ہی رات ہے۔

قرآن میں جا بجا رات کے لئے ظل یعنی سایہ کا لفظ مستعمل ہے، نیز جس طرح رات کے متحرک ہونے کی بات کہی گئی ہے اسی طرح ظل کے متحرک ہونے کا بیان بھی موجود ہے، اب ظاہر سی بات ہے سایہ تبھی متحرک ہوسکتا ہے جب ساتر یعنی جس کی وجہ سے سایہ پیدا ہو رہا ہے وہ حرکت میں ہو، اور سایہ خود زمین کی وجہ سے ہی پیدا ہو رہا ہے، لہٰذا پتہ چلا کہ قرآن کے مطابق رات دن کی آمد و رفت سورج کے سامنے زمین کی محوری گردش کا نتیجہ ہے۔

''لَمْ نَجْعَلْ لَهُمْ'' پر غور فرمائیں! یعنی جس طرح عام جگہوں پر رات

دن کا دورانیہ چوبیس گھنٹوں پر مشتمل ہوتا ہے، اس طرح وہاں نہیں تھا بلکہ وہاں بغیر رات آئے مسلسل کئی دنوں تک سورج بحالت طلوع ہی نظر آتا تھا۔

دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ زمین گول ہے اور اپنے مدار پہ مخصوص زاویہ سے جھک کر حرکت کرتی ہے کیونکہ زمین کو گول اور مخصوص زاویہ پر جھک کر متحرک مانے بغیر یہ تصور قائم ہی نہیں ہوسکتا



کہ زمین کے کسی حصہ پر چوبیس گھنٹوں کے درمیان رات دن کی آمد و رفت بھی ہو اور دوسری طرف مسلسل چوبیس گھنٹوں کے رات اور دن بھی پائے جاتے ہوں! اسی بات کی طرف کَذٰلِكَ سے اشارہ کیا گیا ہے۔

كَذٰلِكَ وَقَدْ أَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ﴿٩١﴾۔ ہاں یہ بالکل ایسا ہی ہے اور وہاں کارفرما ہر امر سے ہم باخبر ہیں۔

مفسرین نے کَذٰلِكَ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جس طرح مغرب الشّمس کے لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے ہوئے ذوالقرنین نے کہا تھا کہ جو ایمان لاکر نیک عمل بجا لائیگا اس کے ساتھ ہم بھی اچھائی کا برتاؤ کرینگے اور آخرت میں بھی اسے بہترین بدلہ دیا جائیگا لیکن جو ظلم کریگا اسے ہم بھی سزا دینگے اور آخرت میں بھی سخت عذاب کا سامنا کرنا ہوگا، ٹھیک اسی طرح مطلع الشّمس کی قوم سے خطاب کرتے ہوئے انہیں بھی خبردار کیا تھا۔

لیکن كَذٰلِكَ کی یہ توضیح درست نہیں ، قرآن جب کسی واقعہ اور جملہ کے اختتام کے بعد كَذٰلِكَ کو مفرد استعمال کرتا ہے تو وہ درحقیقت ماقبل کی عبارت سے قاری کے ذہن میں پیدا ہونے والے کسی تذبذب کو دور کرتا ہے یا ماقبل میں کہی گئی بات کو موکد کرتا ہے جیسے

كَذٰلِكَ وَأَوْرَثْنَاهَا بَنِي إِسْرَائِيلَ ﴿۵۹﴾

كَذٰلِكَ وَأَوْرَثْنَاهَا قَوْمًا آخَرِينَ ﴿۲۸ الدخان﴾

كَذٰلِكَ وَزَوَّجْنَاهُمْ بِحُورٍ عِينٍ ﴿۵۴ الدخان﴾

ثُمَّ نُنَجِّي رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا ۚ كَذٰلِكَ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۰۳ یونس﴾

اسی طرح اس مقام پر كَذٰلِكَ کا مطلب ہوگا کہ ذوالقرنین جہاں گئے تھے اس جگہ پہ واقعتاً سورج چوبیسوں گھنٹے طلوع ہی طلوع نظر آتا تھا اور وہاں ان دنوں رات نہیں ہوتی تھی ۔ ''كَذٰلِكَ یعنی یہ بات بالکل ایسی ہی ہے'' ۔ یہ کہہ کر قرآن نے دراصل ایک وہم کو دور کیا ہے ۔ بظاہر یہ اشکال ہوتا تھا کہ جب زمین گول ہے اور رات دن سورج کے سامنے اسکی گردش کا نتیجہ ہے تو پھر زمین میں کوئی ایسا منطقہ کیوں کر ہوسکتا ہے جہاں دن ہی دن ہو؟ ! کیونکہ ایسی صورت میں زمین کا آدھا حصہ ہمیشہ سورج کے سامنے ہوگا اور آدھا مخالف طرف ، اب اپنے مدار پر محوری گردش کے نتیجہ میں ہمیشہ یہی ہونا چاہیے کہ آدھے حصہ پر دن ہو اور آدھے پر رات؟ اللہ نے اس کا دفعیہ کرتے ہوئے فرمایا کہ بظاہر سمجھ میں نہ آنے والی یہ بات کوئی غیر معمولی اور سمجھ سے بالاتر نہ سمجھی جائے بلکہ سنت اللہ اور تکوینی نظام کے مطابق ہی ہے ۔ چنانچہ دور جدید کے علم نے قرآن کے اس بیان کو سمجھاتے ہوئے

کہا کہ چھ چھ مہینہ تک کی رات اور چھ چھ مہینہ تک کے دن کی اصل وجہ زمین کا اپنے مدار پر ساڑھے تیئس درجہ جھکاؤ اور قطبین پر موسمی کی طرح چپٹا ہونے کا نتیجہ ہے۔

منطقۂ باردہ شمالی (North polar region)

اس تشریح کے بعد اہل علم کے سامنے مزید کسی وضاحت کی ضرورت نہیں رہتی کہ ذوالقرنین جس مطلع الشّمس کے علاقہ میں تشریف لے گئے تھے وہ منطقۂ باردہ شمالی کے علاوہ کوئی نہیں کیونکہ منطقۂ باردہ جنوبی جہاں پہلے تشریف لے گئے تھے اس کے علاوہ یہی وہ علاقہ ہے، جہاں سال میں ۲ دن سے لیکر چھ ماہ تک کے لمبے دن اور اسی طرح کی راتیں پائی جاتی ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ مطلع الشّمس یعنی (North polar region) میں تو گرین لینڈ، آئس لینڈ، ناروے، سویڈن، فنلینڈ، روس، الاسکا اور کناڈا جیسے کئی ممالک شامل جہاں لوگ آباد ہیں، تو پھر ان میں وہ کونسا ملک ہے جہاں ذو القرنین وارد ہوئے تھے۔



یہ علاقہ آرکٹک سرکل میں واقع ''جزائر کناڈا'' میں سے کوئی ایک علاقہ ہوسکتا ہے۔ کیونکہ منطقۂ باردہ شمالی کے دائرے یعنی (Arctic Circle) میں آنے

والے مذکورہ بالا آباد علاقوں میں صرف ’’ جزائر کناڈا ‘‘میں سے ہی (Nunavut) کا کوئی ایک علاقہ ایسا ہوسکتا ہے جہاں طلوعِ شمس کی افق پر اونچائی تقریباً ایک جیسی رہتی ہے۔ ناروے جیسے علاقوں میں بھی سورج چوبیسوں گھنٹے افق پر نظر آتا ہے لیکن اس کی حالتیں بدلتی رہتی ہیں حتیٰ کہ رات کے بارہ بجے کافی نیچے قریب الغروب حالت کو پہنچ جاتا ہے، جسے ’’مڈنائٹ سن‘‘ بھی کہا جاتا ہے۔ لہٰذا ایسی حالت جسے واقعتاً بحالت طلوع کہا جاسکے وہ صرف قطب شمالی کے قریب واقع جزائر کناڈا کے (Nunavut) کے علاقوں میں ہی پائی جاتی ہے۔

مذکورہ قوم جزائر کناڈا کے (Nunavut) کے ہی کسی علاقہ میں رہتی تھی اس کی ایک وجہ اور بھی ہے جسے اگلے صفحات میں بیان کیا جائیگا۔

الغرض ذوالقرنین کا دوسرا سفر ’’شمالی جزائر کناڈا‘‘ کے (Nunavut) کا کوئی علاقہ تھا، جہاں مسلسل کئی دنوں تک چوبیسوں گھنٹے سورج افق ہی افق پر چمکتا نظر آتا تھا۔

مقام ثالث: تعمیر ردم

یاجوج وماجوج کون ہیں، دیوار یاجوج وماجوج یا ردم ذوالقرنین کیا ہے اور کہاں پر واقع ہے؟

ثُمَّ أَتْبَعَ سَبَبًا ﴿٩٢﴾ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِن دُونِهِمَا قَوْمًا لَّا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ قَوْلًا ﴿٩٣﴾ قَالُوا يَا ذَا الْقَرْنَيْنِ إِنَّ يَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ مُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلَىٰ أَن تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ﴿٩٤﴾

قدماء مفسرین اور دور جدید کے مترجمین نے مذکورہ آیت کا جو ترجمہ کیا ہے وہ کچھ اس طرح ہے۔

ترجمہ: اور جب وہ دو پہاڑوں کے درمیان پہنچا تو انکے پاس اس نے ایک قوم کو پایا جو کوئی بات سمجھ نہیں پاتی تھی، انہوں نے کہا کہ اے ذوالقرنین یاجوج اور ماجوج ہمارے ملک میں فساد پھیلاتے ہیں تو کیا ہم تم کو کوئی محصول مقرر کر دیں کہ تم ہمارے اور ان کے درمیان کوئی روک بنا دو۔ ذوالقرنین نے جواب دیا کہ جو کچھ میرے رب نے مجھے دیا ہے وہ بہت ہے، تم محنت سے میری مدد کرو، میں تمہارے اور ان کے درمیان ایک دیوار بنا دونگا۔

زمانہ قدیم سے لیکر آج تک کے تمام مفسرین و مترجمین مذکورہ ذیل چند باتوں پر تقریباً متفق نظر آتے ہیں۔

۱۔ ذوالقرنین کا تیسرا سفر دو پہاڑوں کے درمیان تھا۔

۲۔ان دو پہاڑوں کے پاس ایک قوم سے ملاقات ہوئی، وہ قوم کوئی بات سمجھ نہیں پاتی تھی، یعنی ان سے بات کرنے میں ذوالقرنین کو بڑی دقت پیش آتی تھی کیونکہ وہ بالکل پس ماندہ یا جنگلی قسم کی قوم تھی۔

۳۔اس قوم نے محصول کے بدلے یاجوج ماجوج اور ان کے درمیان کوئی روک بنانے کا مطالبہ کیا تو ذوالقرنین نے کہا کہ میرے پاس خدا کا دیا بہت ہے، مجھے تمہارے محصول یا معاوضہ کی ضرورت نہیں، بس تم صرف محنت و طاقت سے میرا تعاون کرو۔

۳۔اس قوم کے مطالبہ پر ذوالقرنین نے دونوں پہاڑوں کے درمیان لوہے کو پگھلا کر اس پر پگھلا تانبہ ڈالکر ایک مضبوط دیوار بنادی۔

۴۔حاشیہ نگاری کرتے ہوئے کسی نے لکھا کہ سدین سے مراد بحر خزر اور بحر اسود کے درمیان واقع ''کاکیشیا'' کا وہ پہاڑی درہ ہے جو آزربیجان اور آرمینیا کی سرحد پر واقع ہے اور جسے کوہ قفقاز کہا جاتا ہے۔

اسی طرح نقل کیا جاتا ہے کہ خلیفہ واثق باللہ نے اپنے زمانہ میں ایک لشکر محمد ابن موسیٰ خوارزمی کی قیادت میں اس دیوار کی تلاش کے لئے روانہ کیا تھا جو دو سال کی تلاش کے بعد اسے پالینے میں کامیاب ہوکر واپس آیا، اس کی اطلاع کے مطابق یہ دیوار لوہے اور تانبے کی ہے، اس میں نہایت مضبوط عظیم الشان دروازہ بھی ہے، جس پر منوں وزنی تالے بھی پڑے ہوئے ہیں۔

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یاجوج وماجوج کا ملک قطب شمالی کی سمت ایک ایسے

مقام پر ہے جہاں دو بہت اونچے پہاڑ ہیں، دوسرے پہاڑوں کی طرح ان پر چڑھنے کا کوئی راستہ نہیں اور دونوں پہاڑ سمندر کے کنارے پر ہیں، صرف جنوب کی طرف تھوڑا سا راستہ ہے وہاں ذوالقرنین نے اللہ کے حکم سے لوہے کی بہت بڑی دیوار بنادی ہے، یہ دیوار ۶۰ گز چوڑی اور پہاڑوں کے برابر بلند ہے، یاجوج و ماجوج ان پہاڑوں اور آہنی دیوار کے اندر محصور ہیں، وہ اس دیوار کو توڑتے پھوڑتے اور چاٹتے رہتے ہیں تاکہ وہاں سے نکل سکیں، قیامت کے قریب جب اللہ چاہیگا وہ اس دیوار کو توڑ کر مکڑی کی طرح زمین پر پھیل جائینگے، تباہی و بربادی کی آندھی بن کر ہر چیز کو روندتے ہوئے بیت المقدس کے پہاڑ تک پہنچ جائینگے۔

مذکورہ تمام باتوں میں سے ایک بھی درست نہیں۔ آیات کے حقیقی مفہوم کو بالدلائل سمجھنے سے پہلے ترجمہ پر نظر فرمائیں۔

یہاں تک کہ جب وہ ان دونوں بندشوں کے درمیان پہنچا تو اسے مذکورہ دونوں قوموں کے بیچ والے ایک مقام پر ایک ایسی قوم ملی جو کوئی بات سمجھنے کو تیار نہیں تھی۔ انہوں نے کہا کہ اے ذوالقرنین یاجوج اور ماجوج زمین میں فساد مچاتے رہتے ہیں، کیا ہم تمہارے لئے کوئی معاوضہ مقرر کردیں اس شرط پر کہ آپ ہمارے اور ان کے درمیان کوئی روک بنادیں۔ ذوالقرنین نے کہا کہ جن چیزوں میں میرے پروردگار نے مجھے قدرت دے رکھی ہے ان میں (اس سے) بہتر چیز ہے، تو تم لوگ صرف محنت و طاقت سے میرا تعاون کرو، میں تمہارے اور

ان کے درمیان ردم بنادیتا ہوں۔

السدین

اب اجزاء آیت کی تحلیل پر غور کرتے ہیں۔

حَتّٰىٓ إِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِن دُونِهِمَا قَوْمًا لَّا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ قَوْلًا ﴿۹۳﴾

السدین : سد کا تثنیہ ہے ۔سد یسد سدا باب سمع سے ،سد الاناء : برتن ڈھانپنا، سد الثلمۃ: سوراخ یا شگاف بند کرنا، سد الباب: دروازہ بند کرنا، سد الطریق: راستہ روکنا، سد القناۃ: نہر وغیرہ پر ڈیم بنانا۔

السد و السد بفتح السین و ضمہا جمع سدود و اسداد، دو چیزوں کے درمیان آڑ، پہاڑ، پشتہ، بند۔

الغرض سد کا معنی ہوتا ہے، برتن، راستہ، سوراخ اور منفذ کو بند کرنا۔کسی کے لئے مانع بننا (چاہے یہ مانع بننا آمدورفت سے متعلق ہو چاہے دخول وخروج سے یا پھر آر پار دیکھنے سے)۔

سد سکندری، سد ذوالقرنین اور دیوار یاجوج ماجوج اتنی کثرت سے بولا گیا ہے کہ لفظ سد بولتے ہی صرف دیوار کا مفہوم ہی ابھر کر سامنے آتا ہے، حالانکہ جس طرح لفظ سماء ہر اوپر والی چیز کے لئے بولا جاتا ہے اسی طرح لفظ سد کا اطلاق ہر اس چیز پر ہوتا ہے جو کسی چیز کو اس طرح ڈھانپ دے یا اسکے آڑے آجائے کہ وہ دوسری طرف جا نہ سکے یا دیکھ نہ سکے۔ الغرض سد کے مفہوم میں دیوار کے معنی کے بجائے ڈھانپ کر مانع بن جانے یا ڈھانپ کر محفوظ کردینے کا معنی زیادہ

درست ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے: سد الباب، سد الاناء، سد الطریق۔

''السدین'' کی لغوی تحقیق کے بعد یہاں ایک سوال قابل ذکر ہے کہ السدین معرف باللام کیوں ہے؟

اگر السدین سے مراد دو پہاڑ لیے جائیں تو سوال یہ ہوتا ہے کہ جب ماقبل میں پہاڑ کا کوئی تذکرہ نہیں تو پھر اسے معرفہ لانے کی وجہ کیا ہے؟ السدین کو نہ اسم جنس مانا جاسکتا ہے، نہ الف لام زائدہ مانا جاسکتا ہے، الف لام عہد خارجی بھی نہیں ہوسکتا کیونکہ ماقبل میں پہاڑ کا کوئی تذکرہ نہیں، عہد ذہنی یا حضوری بھی نہیں کیونکہ مخاطب اسے جانتا نہیں، تو پھر یہ اسم معرف باللام کیوں ہے؟ کیا قرآن نے خواہ مخواہ ہی سدین کو معرف باللام بنا دیا ہے، یا نحویوں کا استقراء غلط ہے یا پھر مفسرین سے کہیں چوک ہو رہی ہے!

بیشک، السدین سے مراد پہاڑ نہیں بلکہ ماقبل میں مذکور مغرب الشّمس اور مطلع الشّمس کے وہ دو علاقے ہیں جہاں ذوالقرنین تشریف لے گئے تھے۔

''وضع الظاهر موضع المضمر'' کے قاعدے کے مطابق مغرب الشّمس اور مطلع الشّمس کی طرف ضمیر لوٹانے کے بجائے انہیں ''السدین'' کی صفت سے تعبیر کر کے ان کی ایک خصوصیت کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔

مخصوص فوائد و اغراض کے پیش نظر اسم ضمیر کے بجائے اسم ظاہر استعمال کئے جانے کی بے شمار مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً وَقَالَ الَّذِينَ فِي النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ۔ ''لخزنتها'' کے بجائے لخزنة جهنم استعمال کیا گیا ہے۔ اسی

طرح وَمَا يَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَن يُكْفَرُوهُ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ۔ یہاں ''علیم بھم'' کے بجائے ''علیم بالمتقین'' استعمال کیا گیا ہے۔

ان دونوں منطقوں کو قرآن نے ''السدین'' سے کیوں تعبیر کیا ؟ یقیناً کوئی تو خاص وجہ ہے ۔فی الحال اتنا سمجھنے پر اکتفاء کرتے ہیں کہ ان دونوں منطقوں میں کوئی ایسی بات ضرور ہے جو انسانوں کے لئے روک کا کام دیکر حفاظت کا سامان مہیا کررہی ہے۔ان شاء اللہ یاجوج وماجوج کی بحث کے دوران تفصیل سے اس پر گفتگو کی جائیگی۔

الحاصل حتی اذا بلغ بین السدین کا معنی ہوگا: یہاں تک کہ جب وہ ان دونوں بندشوں کے درمیان پہنچا۔

من دونھما

حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِن دُونِهِمَا قَوْمًا لَّا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ قَوْلًا ﴿٩٣﴾

یہاں تک کہ جب وہ ان دونوں بندشوں کے درمیان پہنچا تو اسے مذکورہ دونوں قوموں کے بیچوں بیچ واقع ایک علاقہ میں ایک ایسی قوم ملی جو کوئی بات سمجھنے کو تیار نہیں تھی۔

من دونھما : ''من دون'' لفظ دون پر حرف جر'' من'' لگانے سے بنا ہے، لفظ'' دون'' بہت سارے معنوں میں مستعمل ہے جیسے قبل ، بعد، فوق، خلف، غیر، سوا۔ لیکن''من دون'' لفظ'' دون'' سے مختلف معنوں میں مستعمل ہے۔

اس کا ایک معنی ہے ''بغیر اور سوا'' جیسے مِنۡ دون وَحۡی، اور مِنۡ دون

انتباہ. اسی طرح ''قُلْ أَتَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا'' کیا تم اللہ کے سوا کسی ایسے کی پرستش کرتے ہو جو۔۔۔)۔

اس کا دوسرا معنی ہے ''دو چیزوں کے درمیانی فاصلہ میں کسی جگہ پر کسی چیز کا مقام بتلانا'' جیسے ''عن بن عبّاسٍ، رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا أَنَّهُ قَالَ: لَا يَبِيتَنَّ أَحَدٌ مِنْ دُونِ الْمَأْزِمَيْنِ، وَهُمَا جبلَانِ مِنْ دُونِ الْعَقَبَةِ إِلَى مَكَّةَ۔

یہی معنی مقام اول کی آیت لَمْ نَجْعَل لَّهُم مِّن دُونِهَا سِتْرًا میں مذکور ''مِن دُونِهَا'' میں مراد ہے۔

موضوع بحث ''من دونهما'' میں یہ لفظ کس معنی میں استعمال کیا گیا ہے اسے سمجھنے سے پہلے اس میں لگی ضمیر کا مرجع جان لیتے ہیں۔

''من دونهما'' کی ضمیر کا مرجع کیا ہے؟ السدین ہے یا قومین؟

''من دونهما'' میں ضمیر کا مرجع ''السدین'' کو قرار دیکر اکثر مترجمین نے اس کا معنی ''پرے'' یعنی پیچھے کا کیا ہے جبکہ بعض نے ''پہاڑوں کے پاس'' کیا ہے۔ دونوں معنی درست نہیں، کلام عرب میں ایک بھی مثال ایسی پیش نہیں کی جا سکتی جس میں ''من دون'' کو خلف یا عند کے معنی میں استعمال کیا گیا ہو۔

اگر ''من دون'' کا معنی ''اندر کی طرف'' کیا جائے تب بھی ضمیر کا مرجع ''السدین'' کسی طرح نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ اس وقت معنی کی تکرار لازم آتی ہے ''بین'' کا معنی بھی ''بیچ میں'' اور ''من دونهما'' کا معنی بھی ہے ''دونوں کے بیچ میں'' ۔لازماً ضمیر کا مرجع ماقبل میں ملاقات شدہ دونوں قوموں کو ماننا ہوگا۔

رہی بات ضمیر کے مرجع کے قریب ہونے کی تو قاعدے کی رو سے ضمیر کا مرجع قریب تر کو ماننا یا مرجع کو دوبارہ ذکر کرنا تبھی ضروری ہے جب التباس کا خطرہ ہو لیکن یہاں کسی قسم کا التباس ہی نہیں کیونکہ السدین کو مرجع قرار دینے کی صورت میں لفظی ومعنوی غلطی درپیش آتی ہے، لامحالہ ''من دونہما'' کی ضمیر کا مرجع مذکورہ دونوں قوموں کو قرار دینا ہوگا۔

جب ضمیر کا مرجع مذکورہ دونوں قومیں ہیں تو اب ''من دونہما'' کا معنی کیا ہوگا؟

اب معنی ہوگا '' دونوں قوموں کے بیچ میں''یعنی ایک قوم سے جنوب میں ملاقات ہوئی اور دوسری سے شمال میں، یہ دونوں قومیں جہاں آباد ہیں ان علاقوں سے بالکل درمیانی فاصلے پر وہ قوم بستی ہے جسے قرآن نے'' قوما لایکادون یفقھون قولا'' سے تعبیر کیا ہے۔

من دونھما کا معنی بیچوں بیچ کیوں کر؟ ماسبق میں مثالوں کے ذریعہ واضح کیا جاچکا ہے کہ ''من دون'' دو چیزوں کے درمیانی فاصلہ میں واقع کسی چیز کے مقام کو بھی بتلاتا ہے، جیسے وَهُمَا جَبَلَانِ مِنْ دُونِ الْعَقَبَةِ إِلَى مَكَّةَ ۔ جب تثنیہ کے ساتھ من دون لگیگا جیسے ''من دونھما'' تو اس کی اصل تقدیری عبارت ہوگی ''موضعاً من دونھما'' (ایسی جگہ جو ادھر سے اور ادھر سے درمیانی فاصلے پر ہو)

''موضع بین السدین''

السدین سے مراد مغرب الشمس اور مطلع الشمس لینے کے بعد یہ بات طے

ہوجاتی ہے کہ ’’بین السدین‘‘ والا علاقہ وہی ہے جسے جغرافیہ کی اصطلاح میں خط استوا کے دونوں اطراف والا علاقہ کہا جاتا ہے۔لیکن اب سوال یہ تھا کہ خط استواء اوراسکی دونوں طرف تو دنیا کے بہت سارے مما لک آباد ہیں، ان میں سے وہ کونسی قوم ہے جسے قرآن نے قوما لایکادون یفقھون قولا کہا ہے اورجس قوم نے ذو القرنین سے سد بنانے کا مطالبہ کیا تھا؟



من دونھما کو’’موضعا من دون القومین‘‘ ماننے کی صورت میں یہ بات بڑی آسانی سے طے ہوجاتی ہے کہ وہ علاقہ شمالی اورجنوبی امریکہ کے وسط میں واقع کیوبا ،ہائٹی ، بہاماس اورفلوریڈا کے علاقے ہو سکتے ہیں ، کیونکہ یہی علاقے مذکورہ دونوں قوموں کے بالکل درمیان میں پڑتے ہیں جن سے ذو القرنین نے پہلے ملاقات کی تھی۔

سدذوالقرنین کیاہےاورکہاں ہے؟

قَالُوا يَاذَا الْقَرْنَيْنِ إِنَّ يَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ مُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلَىٰ أَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ﴿٩٤﴾ قَالَ مَا مَكَّنِّي فِيهِ رَبِّي خَيْرٌ فَأَعِينُونِي بِقُوَّةٍ أَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ﴿٩٥﴾ آتُونِي زُبَرَ الْحَدِيدِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا سَاوَىٰ بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انْفُخُوا ۖ حَتَّىٰ إِذَا جَعَلَهُ نَارًا قَالَ آتُونِي أُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا ﴿٩٦﴾ فَمَا اسْطَاعُوا أَنْ يَظْهَرُوهُ وَمَا اسْتَطَاعُوا لَهُ نَقْبًا ﴿٩٧﴾

ترجمہ: ان لوگوں نے کہا کہ اے ذوالقرنین بلاشبہ یاجوج اور ماجوج زمین میں فساد پھیلاتے رہتے ہیں، تو کیا ہم آپ کے لئے کوئی معاوضہ مقرر کر دیں اس شرط پہ کہ آپ ہمارے اور ان کے درمیان کوئی روک بنادیں۔ ذوالقرنین نے کہا کہ میرے پروردگار نے جن چیزوں میں مجھے قدرت دے رکھی ہے اس میں اس (سد) سے بہتر چیز ہے، بس تم لوگ افرادی قوت ومحنت سے میرا تعاون کرو، میں تمہارے اور ان کے درمیان ایک مضبوط رکاوٹ بنادیتا ہوں۔ مجھے خالص لوہے کے مضبوط تختے لادو، یہاں تک کہ جب لوہا پانی کو روکے رکھنے والی دو دیواروں کے درمیان ہموار ہو گیا تو ذوالقرنین نے کہا کہ اب دھونکو، یہاں تک کہ جب اس نے لوہے کو آگ (یعنی تابکار) بنادیا تو کہا کہ اب مجھے سیال تانبہ لادو تاکہ میں اس کی خالی جگہ کو بھر دوں، بس (ایسا کرنے کے بعد) اس قوم کے لئے اس ردم پر آنا محال سا ہو گیا اور (یاجوج وماجوج) کے لئے اس ردم میں شگاف بنانا ناممکن ہو گیا

مفسرین کے بقول: یاجوج و ماجوج نہایت خطرناک، ہلاکت خیز اور کھیتی، باڑی کی تباہی کے علاوہ انسانوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیتے فسادی انسان تھے، ان سے حفاظت کے لئے جب اس قوم نے کوئی دیوار بنانے کا مطالبہ کیا تو ذوالقرنین نے دو پہاڑوں کے بیچ لوہے کے تختے لگا کر اسے دھنکوایا اور جب لوہا پگھل گیا تو اس پر پگھلا تانبہ ڈال کر اسے دیوار کی شکل دے دی، وہ دیوار کچھ اس قدر چکنی اور مضبوط بن گئی کہ اسکے بعد یاجوج اور ماجوج نہ اس دیوار پر چڑھ سکے اور نہ ہی اس میں کوئی سوراخ کر سکے۔

مفسرین کی اس توضیح کے بعد لوگ تاریخ کے تمام ادوار میں دنیا بھر میں ایسی کسی دیوہیکل دیوار کی تلاش میں لگے نظر آتے رہے جو لوہے اور تانبہ سے بنی ہو لیکن آج تک اس کا کہیں بھی پتہ نہیں چلا۔ بالآخر کوئی دیوار چین کو سد سکندری ثابت کرر ہا ہے، کوئی کہتا ہے کہ ارمینیا اور آذربیجان میں واقع پہاڑی سلسلہ ہی سد ذوالقرنین ہے تو کوئی اسکی جگہ ترکمانستان میں بتلاتا ہے، کسی کا کہنا ہے کہ یہ دیوار شمالی علاقے میں واقع ہے، تو کوئی کسی دیگر پہاڑی سلسلہ کو دیوار یاجوج و ماجوج ثابت کرنے پر دلائل دے رہا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

قال الرازیؒ : الأظهر أن موضع السّدين فى ناحية الشمال . وقيل : جبلان بين أرمينية وأذربيجان . وقيل : هذا المكان فى منقطع أرض الترك ۔ محاسن التاويل

لیکن حقیقتاً ایسی کسی دیوار یا پہاڑوں کا کہیں بھی کوئی اتہ پتہ نہیں، اگر کہیں ایسی کسی دیوار کی بتکلف نشاندہی کرنے کی کوشش کی بھی جاتی ہے تو پھر وہاں نہ سد ذوالقرنین کا مطالبہ کرنے والی قوم کا پتہ ہے اور نہ ہی اس کے پیچھے یاجوج اور ماجوج کا کوئی وجود۔

تو پھر سد ذوالقرنین ہے کیا جناب؟

معزز سامعین وقارئین! عرب وعجم کے یہود ونصاری کے علاوہ دنیا بھر کے مسلمان جس سد ذوالقرنین کو ہزاروں سال سے ڈھونڈ رہے ہیں، وہ پہاڑوں کے بیچ بنی کوئی دیوار نہیں بلکہ زمین کے پر اسرار ترین مقامات میں سب سے اول

درجہ رکھنے والا ایک بحری علاقہ ہے جسے دنیا ’’برمیوڈا ٹرائنگل‘‘ کے نام سے جانتی ہے۔ ہاں آپ نے صحیح سنا اور درست پڑھا، ہاں وہی برمیوڈا ٹرائنگل جس کی ہولنا کی کے راز کو دورِ جدید کی حیرت انگیز سائنسی ترقی کے باوجود حل نہیں کیا جا سکا۔ اور ہاں ذوالقرنین ہی اس کا وہ معمارِ اعظم ہے جسے خالق کائنات نے بے لاگ زمینی تصرفات کا مالک بنا رکھا تھا۔



برمیوڈا ٹرائنگل کیا ہے؟

بحر اوقیانوس میں برمیوڈا (Bermuda)، فلوریڈا (Florida) اور پیورٹو ریکو (Puerto Rico) سے بننے والے تکون کے درمیان دنیا کا پراسرار ترین اور لاکھوں مربع کلومٹر پر مشتمل ایک سمندری علاقہ واقع ہے، اس علاقہ میں اب تک بے شمار لوگوں کے علاوہ اس پر سے گذرنے والے ہزاروں طیارے اور



آبی جہاز اس طرح غائب ہو چکے ہیں کہ ان کا ملبہ اور نام ونشان تک نہیں ملتا، پہلے ان جہازوں کے کمپاس بے ہنگم حرکت کرنے لگ جاتے ہیں، برقی آلات کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں، اس کے بعد بیس سے رابطہ ختم ہو کر رڈار سے بھی ان کا تعلق ختم ہوجاتا ہے، پھر وہ اس طرح غائب ہوجاتے ہیں کہ ان کا نام ونشان بھی نہیں ملتا، گمشدہ جہازوں اور طیاروں کی کھوج میں جانے والے جہاز بھی اسی طرح گم ہو کر رہجاتے ہیں۔

برمیوڈا ٹرائنگل کی پراسراریت پر بے شمار کتابیں، مضامین اور فلمیں بن چکی ہیں لیکن ایسا کیسے اور کیوں ہورہا ہے یہ آج تک ایک ان سلجھا راز ہی ہے،

اس علاقہ کی اس قسم کی ہولنا کی کو دیکھتے ہوئے کوئی اسے شیطانی سمندر کا نام بھی دیتا ہے، تو کوئی خلائی مخلوق کی گذرگاہ بتلاتا ہے۔ سائنس داں وقتاً فوقتاً مختلف قسم کے نظریات پیش کر کے اس کے راز کو سلجھانے کی کوشش کرتے رہے ہیں، کبھی اس کے لئے گلف اسٹریم کو ذمہ دار مانا جاتا ہے تو کبھی میتھین ہائڈریٹ گیس کو، کبھی کہا جاتا ہے کہ اس کی وجہ الیکٹرومیگنیٹک فیلڈ کی وجہ سے بننے والا الیکٹرانک فوگ ہے تو کبھی کہا جاتا ہے کہ اس کے لئے ۲۷۵ کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے چلنے والی تیز ہواؤں کے طوفان تو کبھی سوفٹ بلند اٹھنے والی پانی کی لہروں کو ذمہدار مانا جاتا ہے ۔حال ہی میں ایک نظریہ پیش کیا گیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ برمیوڈا ٹرائنگل میں اس قسم کی تباہی بادلوں کے بم (ایئر بم) برسانے والے ہیکزاگون یعنی مسدس شکل کے بادلوں کی وجہ سے ہوتی ہے۔

الغرض اربوں سال پہلے دنیا کس طرح وجود میں آئی، لاکھوں نوری سال کے فاصلوں پر کیا کیا ہو رہا ہے، سورج کی تہہ میں کیا موجود ہے، مریخ کے مرکز میں کیا ہو رہا ہے، زمین کتنے طبقات پر مشتمل ہے اور ان میں کیا کیا ہے؟ یہ سب بتلا دینے والے سائنس دانوں کے پاس اب تک برمیوڈا ٹرائنگل کی پراسراریت کو حل کرنے کے لئے کوئی قابل اعتماد ثبوت نہیں۔

ردم ذوالقرنین کے متعلق آیتوں کے معانی ومفاہیم کو اچھی طرح سمجھنے سے پہلے ہم یہاں پھر دوہراتے چلیں کہ چاہے انسان جتنی کوشش کر لے، ترجموں و تفاسیر کے ذریعہ قرآن کریم کے مطالب سے قریب کرنے کی کوشش تو کی جاسکتی

ہے لیکن اس کی حقیقی عظمت کو ہرگز ہرگز سمجھا یا نہیں جا سکتا، اس کے حقیقی مفاہیم اور اعجاز کو سمجھنے کے لئے اصول فصاحت و بلاغت کے ساتھ ساتھ خالص قرآنی عربی سے واقفیت ضروری ہے۔

شروع میں یہ بات بتلائی جا چکی ہے کہ قصۂ ذوالقرنین کی ابتدائی آیت میں وارد ''اتلوا ور ذکرا'' کے الفاظ ہمیں بتلاتے ہیں کہ اگلی آیتوں میں ذوالقرنین کی زندگی کا تذکرہ مختصر تو ہوگا مگر مدلل ہوگا تا کہ قیامت تک آنے والے انسانوں کے لئے نصیحت بن سکے۔

چنانچہ ذوالقرنین کے متعلق دعوی کرتے ہوئے قرآن نے کہا: انا مکنا لہ فی الارض و آتیناہ من کل شیئ سبا۔ہم نے اسے زمین کے تکوینی امور میں تصرفات کی قدرت دے رکھی تھی اور اسے نقل وحمل کے لئے ہر طرح کی سواری عطا کی تھی۔

مقام ثالث اس دعوے کو ثابت کرنے کے لئے خاص اہمیت کا حامل ہے، دیکھتے ہیں کہ ذوالقرنین کس قسم کے تکوینی امور میں اختیار کا مالک تھا اور اسے کس قسم کی سواریاں عطا کی گئی تھیں۔

اللہ تعالیٰ نے ذوالقرنین کو بھی خضر علیہ السلام کی طرح غیر معمولی قوت سے نوازا تھا، روئے زمین کے مختلف علاقوں کے سفر کے دوران جہاں کہیں لوگوں کو تکوینی امور سے متعلق کوئی غیر معمولی مسئلہ درپیش ہوتا تو ذوالقرنین اسے اپنی خداداد صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے حل فرما دیتے۔

چنانچہ جب وہ براعظم شمالی وجنوبی امریکہ کے بیچ واقع خط استواء کے آس پاس موجود کسی علاقہ میں پہنچے تو وہاں رہنے والوں نے ذوالقرنین سے شکایت کرتے ہوئے کہا کہ یاجوج اور ماجوج نے اس علاقہ میں کافی فساد مچا رکھا ہے، اگر آپ ہمارے اور ان کے درمیان کوئی روک بنا دیں تو ہم آپ کو معاوضہ دینے کو تیار ہیں۔

ذوالقرنین نے فرمایا کہ میرے پروردگار نے تکوینی امور میں جو قدرت و اختیار مجھے عطا کی ہے اس کے مطابق میں سد سے بہتر چیز بنا سکتا ہوں، بس آپ لوگوں کو افرادی طاقت سے میرا تعاون کرنا ہوگا، اگر آپ لوگ محنت کرنے کو تیار ہیں تو میں تمہارے اور یاجوج ماجوج کے درمیان (سد کے بجائے) ردم بنا دیتا ہوں۔

سد اور ردم میں فرق؟

سد کے متعلق ماقبل میں وضاحت ہوچکی ہے کہ سد ہر اس چیز کے لئے بولا جاتا ہے جو برتن، راستہ، سوراخ اور منفذ کو بند کردے، یا کسی کے لئے مانع بن جائے (چاہے یہ مانع بننا آمد ورفت سے متعلق ہو، چاہے دخول وخروج سے یا پھر آر پار دیکھنے سے)۔سد الاناء: برتن ڈھانپنا،سد الثلمة: سوراخ یا شگاف بند کرنا،سد الباب: دروازہ بند کرنا، سد الطریق: راستہ روکنا،سد القناة: نہر وغیرہ پر ڈیم بنانا۔

جبکہ ردم کہتے ہیں: ما جُعِلَ بعضُہ علی بَعْضٍ کو۔ردم الثلمة: رخنہ کو

اچھی طرح بند کرنا۔ ردم الثوب : کپڑے کو اوپر تلے پیوند لگانا ۔ ردم السحاب: بادلوں کا تہ بتہ ہونا۔ردمت الحمی : بخار کا باری باری ہمیشہ لگے رہنا ۔ثوب مردم و مرتدم : اوپر تلے پیوند لگا کپڑا۔ تردم القوم الارض: زمین کی پیداوار کو بار بار کھانا۔

ر دم | رَدَمَ البَابَ والثُّلْمَةَ ونَحْوَهما يَرْدِمُهما رَدْماً : سَدَّهُ، وقِيلَ : الرَّدْمُ أكْثُر من السَّدّ؛ لأنّ الرَّدْمَ : ما جُعِلَ بعضُه على بَعْضٍ ، والاسمُ الرَّدْمُ ، وجمعُه رُدُومٌ . | والرَّدْمُ : السَّدُّ الذى بَيْنَنا وبَيْنَ يَأْجُوجَ ومَأْجُوجَ . وفى التنزيل : ^ (أَجْعَلْ بَيْنكمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْماً) ^ [الكهف : ٩٥] . | والرَّدْمُ : ما يَسْقُطُ من الجِدارِ إِذا انْهَدَمَ . | وكُلُّ ما لُفِّقَ بعضُه ببعضٍ فقَدْ رُدِمَ . وثَوْبٌ مُرَدَّمٌ ، ومُرْتَدَمٌ ، ومُتَرَدَّمٌ : خَلَقٌ مُرَقَّعٌ ، قالَ : (هَلْ غادَرَ الشُّعَراءُ مِنْ مُتَرَدَّمِ) أي : من كَلامٍ يُلْصَقُ بعضُه بَبعْض ويُلَفَّقُ ، أَى : قد سُبَقُونَا إِلى القَوْلِ، فلم يَدَعُوا مَقالاً لقائِلٍ . | وتَرَدَّمَتِ النَّاقَةُ : عَطَفَتْ على وَلَدِها . | وتَرَدَّمَ القَوْمُ الأَرْضَ : أَكَلُوا مَرْتَعِها مَرَّةً بعدَ مَرَّةٍ . | وأَرْدَمَتْ عليه الحُمَّى ، وهى مُرْدِمٌ : دامَتْ . | وأَرْدَمَ عليه المَرَضُ : لَزِمَه . المحكم و المحيط الاعظم

سد اور ردم میں کچھ بنیادی فرق ہیں۔

پہلا: سد کے مقابلہ ردم زیادہ مضبوط ہوتی ہے۔

دوسرا: ''ردم'' شگاف اور منفذ کو اچھی طرح مضبوطی سے بند کرنے کا نام ہے، جبکہ ''سد'' محض ایک آڑ کی حیثیت رکھتی ہے جو اطراف سے کھلی ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ

ہے کہ سد شیٔ مسدود کے ساتھ یکجان نہیں ہوتی، جبکہ ردم شیٔ مردم کے ساتھ یکجان ہوتی ہے۔ لہٰذا سد کے لئے فتح اور ردم کے لئے نقب اور دکاء جیسے الفاظ استعمال ہو نگے۔

تیسرا : سد اور ردم میں سب سے اہم اور بنیادی فرق یہ ہے کہ ردم تہہ بتہ یا اوپر تلے ہو کر بنتی ہی جبکہ سد کوئی ایک مفرد چیز بھی ہو سکتی ہے۔

سد اور ردم کے درمیان فرق کی اس وضاحت کے بعد یہ بات سمجھنی آسان ہو جاتی ہے کہ دو پہاڑوں کے درمیان لوہا پگھلا کر تانبہ ڈالنے سے دیوار کی طرح جو شکل وجود میں آئے اس پر سد کا اطلاق تو ہو سکتا ہے لیکن ردم کا نہیں، بلکہ ردم کوئی ایسی چیز ہے جس سے زمین کے کسی ایسے منفذ یا شگاف کو اچھی طرح بند کر دیا گیا ہے جہاں سے یاجوج و ماجوج نکلا کرتے تھے۔

یہاں ایک اہم سوال ہے کہ آخر اس قوم نے یاجوج و ماجوج کو قتل کر دینے کے بجائے ان کے اور یاجوج و ماجوج کے درمیان سد بنانے کا مطالبہ کیوں کیا؟

یاجوج و ماجوج انسانوں کے لئے نہایت تباہ کن حیثیت رکھتے ہیں اس میں کوئی دورائی نہیں لیکن وہ کوئی فسادی انسان یا کوئی چھوٹی موٹی مخلوق نہیں تھے کہ انہیں قتل کر کے ان سے نجات حاصل کر لی جاتی۔ اگر یاجوج و ماجوج واقعتاً انسان ہو کر فسادی ہوتے تو ذوالقرنین انہیں یقیناً قتل کر کے ختم کر سکتے تھے جیسا کہ مقام اول (جنوبی امریکہ کے علاقے) میں ذوالقرنین نے کہا تھا: اما من ظلم فسوف نعذبہ، لیکن یہ مخلوق کچھ اس طرح خطرناک تھی کہ سد کا مطالبہ

کرنے والی قوم بھی جانتی تھی کہ انہیں بجز سد کے روکا نہیں جا سکتا تھا، اسی طرح ذو القرنین نے بھی انہیں ختم کرنے کے بجائے ردم بنانے کی تجویز پیش کی۔

یاجوج و ماجوج اپنی خطرناکی اور کثرت کے ساتھ جس جگہ سے نکلا کرتے تھے وہ منفذ بھی غیر معمولی طور پر بہت بڑا تھا، یہی وجہ ہے کہ ذو القرنین نے فرمایا تھا کہ میں سد کے بجائے ردم بنا دینے کو تیار ہوں، تمہارے معاوضہ کی بھی مجھے ضرورت نہیں البتہ افرادی قوت درکار ہوگی، تبھی اتنا عظیم الشان کام پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتا ہے۔ اگر کام صرف اتنا آسان ہوتا جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے کہ لوہے کے تختے لا کر دو پہاڑوں کے بیچ رکھے گئے، انہیں دھونکا گیا، جب لوہا پگھل گیا تو اس پر پگھلا تانبہ ڈالکر ٹھوس دیوار بنا دی گئی، تو ایسا کرنے میں ذو القرنین کا کمال کیا ہے! یہ سب کام تو اسی قوم نے انجام دئے ہیں، اس میں ذو القرنین کی مدد لینی کی ضرورت ہی کیا تھی؟ جبکہ اللہ تعالیٰ تو فرماتے ہیں: انا مکنالہ فی الارض۔ کہ ہم نے اسے تکوینی امور میں اختیار دیا تھا ۔ اگر دو پہاڑوں کے بیچ لوہے اور تانبے کی دیوار بنا دینے کا معنی مراد لیا جائے تو ایسی صورت میں آیت والے دعوے کا مصداق ثابت نہیں ہوتا۔ لہذا تعمیر ردم کا کام یقیناً کوئی نہایت غیر معمولی کام تھا۔

تعمیر ردم

آتُونِي زُبَرَ الْحَدِيدِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا سَاوَىٰ بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انفُخُوا ۖ حَتَّىٰ إِذَا جَعَلَهُ نَارًا قَالَ آتُونِي أُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا ﴿٩٦﴾ فَمَا اسْطَاعُوا أَن يَظْهَرُوهُ وَمَا اسْتَطَاعُوا لَهُ نَقْبًا ﴿٩٧﴾

آیات میں موجود حیرت انگیز انکشافات کو اچھی طرح سمجھنے سے پہلے چند الفاظ کی توضیح کرتے چلیں۔

زُبَرَ الْحَدِيْدِ: "زُبَر" زبرۃ کی جمع ہے، لوہے اور پتھر جیسی مضبوط اور لمبی چوڑی چیز کے لئے بولا جاتا ہے جیسے تختی۔ زبرۃ کے معنی میں مضبوطی اور چوڑائی کا معنی پایا جاتا ہے۔ جیسے الزبیر: چوڑے سینے والا طاقتور مرد۔ الازبر: چوڑے کندھوں والا مرد۔

زُبَرَ الْحَدِيْدِ کا معنی ہوگا: لوہے کے لمبے چوڑے اور مضبوط تختے (Steel Plates)۔

سَاوٰى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ: سَاوٰى: یساوی مساواۃ (فعل لازم) کسی کے ہم پلہ ہونا، برابری کرنا، ایک دوسرے کے متوازی ہونا، ہموار ہونا، ساوی فلان قرنہ، ساوی بہ فی العمر۔ ساوی الحدید بین الصدفین (لوہے کی پلیٹس ایک دوسرے کے مساوی ہوگئیں)

الصَّدَفَيْنِ: صدف یصدف صدفا و صدوفا، صدف عنہ: ہٹنا، باز رہنا، پھر جانا، اعراض کرنا۔ تصدف لہ: رکاوٹ بننا، آڑے آنا۔ صدف فلانا عن الشیئ صدفا: روکنا، باز رکھنا، ہٹانا، پھیرنا۔

الصدف جمع اصداف: سیپ (موتی کا خول)، ہر بلند چیز جیسے دیوار، پہاڑ وغیرہ، گوشہ، صدفا الجبل: پہاڑ کے دو متقابل کنارے۔ آیت میں الصدفین سے مراد کمانی شکل کی وہ دو دیواریں ہیں جن کے ذریعہ سمندر کے پانی کو روکا گیا تھا

تا کہ ردم بنائی جا سکے، (''الصدف'' کا اصل معنی ہے روکنے والا اور باز رکھنے والا)۔ ساوی الحدید بین الصدفین : لوہے کی پلیٹیں دونوں دیواروں کے درمیان ہموار ہوگئیں۔ یہاں دھیان دینے کی ضرورت ہے: لوہا دونوں دیواروں کے برابر ہوگیا، یہ ترجمہ نہیں ہوگا، بلکہ درمیان میں اس طرح ایک دوسرے کے مساوی ہوگیا کہ ان کے بیچ جگہ خالی رہے۔یہی معنی ہوگا''ساوی '' اور''بین الصدفین '' کا۔

انۡفُخُوا : نفخ ینفخ نفخا (نصر ینصر) نفخ بفمه : منہ سے پھونک مارنا، نفخ فی البوق: سنکھ بجانا، نفخ النار (بالمنفاخ)دھونکنی سے آگ بھڑکانا۔

جَعَلَهٗ نَارًا : جب اس نے لوہے کو آگ (یعنی تابکار) بنادیا۔توجہ فرمائیں! آیت میں''نار'' کا لفظ ہے اس سے مراد'' پگھلا لوہا''نہیں لیا جائیگا،لوہے کے پگھلنے اور آگ (یعنی تابکار) بننے میں بڑا فرق ہے۔

''نار''یعنی آگ کا لفظ بولتے ہی لکڑی،کوئلہ یا گیس کے جلنے سے اٹھتے شعلے ہماری نظروں کے سامنے آجاتے ہیں۔اس مفہوم میں قرآن نے نار کا لفظ بہت کم جگہوں پر استعمال کیا ہے، جبکہ زیادہ تر مقامات میں نار کو''حرارت وتوانائی کے اخراج'' یا''اشعاع اور تابکاری'' کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ملاحظہ فرمائیں

فَأَصَابَهَا إِعۡصَارٌ فِيهِ نَارٌ فَاحۡتَرَقَتۡ ﴿۲٦٦ البقرة﴾

اعصار : تیز ہوا، بگولہ

وَالۡجَانَّ خَلَقۡنَاهُ مِن قَبۡلُ مِن نَّارِ السَّمُومِ ﴿۲۷ الحجر﴾

سمت الریح : ہوا کا جھلسا دینا۔ السموم : جسم کے اندر گھس جانے والی شدید گرمی۔ سم الابرۃ ونحوہ: سوئی وغیرہ کا سوراخ بنانا۔ سم الثقب : سوراخ میں گھسنا۔ سم الامر: کسی معاملہ کی گہرائی میں جانا۔

وَخَلَقَ الْجَانَّ مِنْ مَارِجٍ مِنْ نَارٍ ﴿۱۵ الرحمن﴾

المارج : انتہائی تیز شعلہ (جس کے ساتھ دھواں نہ ہو) دراصل ''مرج'' کا معنی ہے آزاد چھوڑ دینا اور کسی کے اندر تک گھس جانا جیسے رجل مارج: آزاد آدمی جس پر کوئی لگام نہ ہو۔ المرج : چراگاہ میں بے روک یا بے نگراں چرنے والے اونٹ۔ المرّاج: جھوٹا یعنی ایسا شخص جو کسی کے بارے میں بلا جھجک کچھ بھی بولتا رہے۔

الغرض قرآن میں نار آگ کی مختلف قسم کی کیفیت وصفات کو بیان کرنے والے معانی میں استعمال ہوا ہے، لہٰذا نار سے صرف وہ آگ مراد لینا جسے ہم اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہیں، یہ درست نہیں۔ ذرہ ''اعصار فیہ نار'' یا ''جن'' کی تخلیق بتلاتی آیتوں میں وارد ''مارج من نار'' اور ''من نار السموم'' اور اسی طرح '' نار جہنم'' کی کیفیت بیان کرتی فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ جیسی آیتوں پر غور فرمائیں، ان میں کسی بھی لفظ سے آگ کا وہ معنی مراد نہیں لیا جاسکتا جس کا ہم اپنی آنکھوں سے مشادہ کرتے ہیں۔ بے شک لکڑی وغیرہ جلنے سے بھی حرارت وتوانائی کا ہی اخراج ہوتا ہے لیکن تخلیق جن اور نار جہنم کی صفت میں وارد قرآن کے الفاظ کسی ایسی آگ کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو تیز شعاؤں کی شکل میں نکلتی ہے۔

قِطۡرًا : القطر : عام طور اس سے پگھلا ہوا تانبہ مراد لیا گیا ہے۔ درحقیقت قطر سے مراد وہ ایندھن ہے جو کسی جگہ ہونے والی حرارت وتوانائی کے اخراج یا تابکاری کو جاری رکھنے اور اسکی شدت کو بڑھانے کا کام کرتی ہے۔

يُرۡسَلُ عَلَيۡكُمَا شُوَاظٌ مِّن نَّارٍ وَنُحَاسٌ فَلَا تَنتَصِرَانِ ﴿۳۵ الرحمن﴾

وَأَسَلۡنَا لَهُ عَيۡنَ الۡقِطۡرِ ﴿۱۲ سبإ﴾

مزید تفصیل اگلے صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔

أُفۡرِغۡ عَلَيۡهِ : فرغ یفرغ فراغا، فروغا و فرغا ۔ فرغ الظرف : برتن کا خالی ہونا، فرغ عن الامر : کام سے فارغ ہونا (کام کو پورا کرنا) فرغ علیه الماء : پانی انڈیلنا ، افرغ الذهب و نحوه : سونا وغیرہ کو سانچہ میں ڈالنا۔ کسی چیز کے ذریعہ خالی جگہ بھر دینا۔ آتونی افرغ علیه (بین الصدفین) قطراً : مجھے سیال تانبہ لا دو تا کہ (دو دیواروں کے درمیان میں) جلتے لوہے کے تراشوں پر انڈیل کر بھر دوں ۔

فَمَا اسۡطَاعُوا أَن يَظۡهَرُوهُ وَمَا اسۡتَطَاعُوا لَهُ نَقۡبًا ۔

اسۡطَاعُوا و اسۡتَطَاعُوا : استطاع، استطاعة الأمر : کسی کام کی طاقت رکھنا ۔ کتب صرف میں لکھا ہے کہ استطاع ، یستطیع ، استطاعة کی تاء کو حذف کر کے اسطاع یسطیع بولنا بھی جائز ہے، جیسا کہ زیر بحث آیت میں اس کی مثال موجود ہے۔ لیکن حذف جائز ہونے کا مطلب اگر یہ ہے کہ اس سے معنی میں کوئی فرق نہیں پڑتا تو یہ بات درست نہیں بلکہ " زیادتی الفاظ معنی کی

زیادتی پر اور تخفیف الفاظ تخفیف معنی پر دلالت کرتے ہیں''، اس اصول کے تحت معنی میں بھی فرق پیدا ہو جائیگا۔

أَنۡ يَظۡهَرُوهُ : ظهر ، يظهر ظهرا البيت : مکان پر چڑھنا۔ ظهر ظهورا : ظاہر ہونا۔ ظهره : پیٹھ پر مارنا، ظهر بفلان و عليه: کسی پر غالب آنا۔ فَمَا اسۡطَاعُوا أَنۡ يَظۡهَرُوهُ : ان لوگوں کے لئے ردم پر چڑھ آنا محال سا ہو گیا۔

نَقۡبًا : النقب : سوراخ۔ نقب ينقب نقبا ، عام طور پر بند چیز میں سوراخ کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے، جیسے نقب اللص حائط الدار : چور نے گھر کی دیوار میں چھید کر دیا (نقب زنی کی)۔ وَمَا اسۡتَطَاعُوا لَهُ نَقۡبًا : ان (یاجوج و ماجوج) کے لئے ردم میں سوراخ کرنا ناممکن ہو گیا۔

یہاں دو باتیں قابل توجہ ہیں

ایک: ''فَمَا اسۡطَاعُوا'' اور ''وَمَا اسۡتَطَاعُوا'' کے معنی میں فرق، پہلے کا ترجمہ ''محال سا'' یعنی تقریباً ناممکن، جبکہ دوسرے کا ترجمہ ''ناممکن'' سے کیا ہے، اس فرق کی وجہ حذف تاء ہے۔ یعنی تخفیف الفاظ معنی کی تخفیف پر دلالت کرتے ہیں۔

نمبر دو: فَمَا اسۡطَاعُوا أَنۡ يَظۡهَرُوهُ وَمَا اسۡتَطَاعُوا لَهُ نَقۡبًا : تقریباً اجماعی طور پر سبھی مفسرین نے ''فَمَا اسۡطَاعُوا'' اور ''وَمَا اسۡتَطَاعُوا'' دونوں کی ضمیر کا مرجع یاجوج و ماجوج کو قرار دیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

{فما استطاعوا أن يظهروه وما استطاعوا له نقبا} يقول تعالى مخبراً

عن يأجوج ومأجوج أنهم ما قدروا على أن يصعدوا من فوق هذا السد ،ولا قدروا على نقبه من أسفله۔

جبکہ صحیح بات یہ ہے کہ ''فَمَا اسْطَاعُوا أَنْ يَظْهَرُوهُ'' کی ضمیر کا مرجع لوگ یعنی سد بنانے کا مطالبہ کرنے والی قوم ہے، اور'' وَمَا اسْتَطَاعُوا لَهُ نَقْبًا'' کی ضمیر کا مرجع یاجوج وماجوج ہے۔ ضمیر کا مرجع الگ الگ ماننے کی دو بڑی وجہ ہیں۔

ذرہ پیچھے جائیں، قوم نے سد کا مطالبہ کرتے ہوئے کہا تھا: فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلَى أَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا : آپ ہمارے اور ان کے درمیان سد بنا دیں، مطلب ایسی سد کہ نہ ہم ان کے علاقے میں جا سکیں اور نہ وہ ہمارے علاقے میں آسکیں۔ یہ نہیں کہا کہ أن تجعل بين ايديهم سدا :کہ بس وہ ہمارے علاقے میں نہ آسکیں کیونکہ چھری خربوزے پر گرے یا خربوزہ چھری پر گرے بات تو ایک ہی ہے۔ ذوالقرنین نے بھی جواب دیتے ہوئے فرمایا تھا: فَأَعِينُونِي بِقُوَّةٍ أَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا :میں تمہارے اور ان کے درمیان ردم بنا دوں گا، یعنی نہ تم لوگ ان کے علاقے میں جا سکو اور نہ وہ تمہارے علاقہ میں آسکیں۔ سد یا ردم کے بیننا و بینهم ہونے کا مطلب یہی ہوگا کہ وہ ایک دوسرے کے لئے مانع بن جائے۔ چنانچہ جو ردم بن کر تیار ہوئی اس کی خوبی یہ ہے کہ انسان آج بھی وہاں جا نہیں سکتا اور نہ ہی یاجوج و ماجوج اندر سے اس میں نقب لگا سکتے ہیں۔

دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ جب ردم کے ذریعہ یاجوج و ماجوج کو زمین کے

اندراس طرح مقید کر دیا گیا ہے کہ وہ نقب ہی نہیں لگا سکتے تو پھر ردم پر چڑھ آنے کا تو سوال ہی نہیں ، اگر ایسی صورت میں دونوں کا مرجع ایک قرار دیا جائے تو کلام میں لایعنی زیادتی ثابت ہوگی۔

قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ فَإِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا ﴿۹۸﴾

ذوالقرنین نے کہا کہ یہ میرے پروردگار کی رحمت ہے، جب میرے رب کا وعدہ آپہنچیگا تو وہ اسے تہس نہس کر دیگا، اور میرے رب کا وعدہ سچا ہے۔

خلاصۂ آیات

جب ذو القرنین بین السدین والے علاقے میں پہنچے تو وہاں ان کی ملاقات ایک ایسی قوم سے ہوئی جو اللہ کی کسی نشانی سے عبرت لینے کو تیار نہیں تھی ۔نہ کبھی آفاق وانفس کی نشانیوں سے سبق لینے کی کوشش کی، نہ انبیاء ورسل کی باتیں سنیں، نہ اقوام ماضی کی داستانوں سے نصیحت لی اور نہ ہی بشکل عذاب وارد یاجوج وماجوج کے خروج سے عبرت لینے کی کوشش کی۔

یاجوج و ماجوج کے حملہ کو عذاب سمجھ کر اللہ وحدہ پر ایمان لے آنے کی بجائے اس قوم نے ذوالقرنین سے شکایت کرتے ہوئے کہا کہ یاجوج اور ماجوج نے زمین میں فساد مچا رکھا ہے، اگر آپ ہمارے اور ان کے درمیان کوئی روک بنادیں تو ہم آپ کو معاوضہ دینے کو تیار ہیں۔

ذوالقرنین نے کہا کہ میرے پروردگار نے زمینی تصرفات کی جو قدرت و اختیار مجھے دے رکھی ہے اس حساب سے میں سد سے بہتر چیز بنا کر دے سکتا ہوں ،لیکن

آپ لوگوں کو افرادای طاقت سے میرا تعاون کرنا ہوگا، اگر تم لوگ مدد کر سکتے ہو تو میں سد کے بجائے آپ کے اوران کے درمیان ردم بنادینے کو تیار ہوں۔

وہ قوم محنت کرنے کو تیار ہوگئی تو ذوالقرنین نے کہا کہ آپ لوگ مجھے مضبوط لوہے کے مضبوط اور لمبے چوڑے تختے مہیا کردو، (تختے لے آنے کے بعد) جب سمندر کے پانی میں موجود منفذ (جہاں سے یاجوج اور ماجوج نکلا کرتے تھے اس) کی دونوں جانب پانی کو روکے رکھنے والی دو دیواروں کے درمیان لوہے کے مضبوط تختے اچھی طرح ایک دوسرے کے متوازی نصب کردئے گئےتو ذوالقرنین نے کہا کہ انہیں دھونکو، جب ذوالقرنین کی تدبیر وحکمت اور خداداد تکوینی علوم کے نتیجہ میں مخصوص زاویہ سے لگائی گئیں لوہے کی پلیٹیں جلنےلگیں (یعنی تابکاری دینے لگی) تو کہا کہ اب مجھے سیال تانبہ لا دو تا کہ میں ان کے درمیان موجود خالی جگہ میں اسے انڈیل دوں، (جب تابکاری کرتی پلیٹوں کے بیچ بہتا تانبہ ڈال دیا گیا تو اس کے نتیجہ میں ایسی ردم تیار ہوگئی کہ) اس قوم کے لوگوں میں اس ردم پر چڑھ آنے کی طاقت نہیں رہی اور اسی طرح یاجوج اور ماجوج کے لئے اس ردم کو اندر سے سوراخ کرنا ناممکن ہوگیا۔

(اس طرح عظیم الشان ردم بن جانے کے بعد) ذوالقرنین نے کہا کہ یہ میرے پروردگار کی طرف سے رحمت ہے، لیکن جب میرے رب کے وعدے کا وقت آپہنچیگا تو وہ اسے تہس نہس کردیگا۔

یعنی ردم صرف اپنی بدعملی اور ناسمجھی کی وجہ سے یاجوج وماجوج کے عذاب

کی مستحق قوم کے لئے ہی رحمت نہیں تھی بلکہ قیامت تک آنے والی انسانیت کے لئے بھی حفاظت کا سامان ہے۔اور ردم بھی ایسی کہ قیامت تک اسے کچھ بھی نہیں ہوگا بلکہ اس کی یہ حالت ہمیشہ اسی طرح برقرار رہیگی ، ہاں جب قیامت کا دن آپہنچے گا تو اللہ عزوجل اسے کالعدم بنادینگے۔

الحاصل

آیتوں کی مذکورہ بالا وضاحت کے بعد اس بات میں کسی قسم کا شک وشبہ باقی نہیں رہتا کہ برمیوڈا ٹرائنگل ہی درحقیقت ردم ذوالقرنین ہے۔

ا۔قرآن کے مطابق ردم ذوالقرنین کی جائے وقوع بھی وہی ہے جہاں پر برمیوڈا ٹرائنگل واقع ہے۔

۲۔ جو خصوصیت برمیوڈا ٹرائنگل میں پائی جاتی ہے کہ اس پر سے کوئی انسان گذر نہیں سکتا تو وہی بات قرآن بھی ردم ذوالقرنین کے متعلق کہتا ہے۔

۳۔ ہاں کسی کو شبہ پیدا ہوسکتا ہے کہ مانا کہ قرآن کے مطابق ردم ذوالقرنین کی جائے وقوع بھی وہی ہے جہاں برمیوداٹرائنگل واقع ہے، یہ بات بھی درست ہے کہ ردم ذوالقرنین کے جو اثرات ہیں وہی برمیوڈا ٹرائنگل میں بھی پائے جاتے ہیں لیکن ہزاروں کلومیٹر میں پھیلا ہوا یہ کام کسی انسانی کاوش کا نتیجہ کیسے ہوسکتا ہے؟

ایسا سوال پیدا ہونے کی دو وجہیں ہیں۔ایک وجہ تو یہ ہے کہ ارتقائیوں نے ہمارے ذہنوں میں یہ بات مسلط کر رکھی ہے کہ سائنس دور جدید کے ارتقاء یافتہ دماغ کی پیداوار ہے، ماضی کا انسان اس قسم کی سائنسی باتوں سے بالکل نابلد تھا۔

اسی فکر کے نتیجہ میں ماضی کے انسان کی سائنسی ترقی پر دلالت کرنے والے اہرام مصر، نز کا لائنس جیسی بے شمار انسانی باقیات کو سمجھنا مشکل ہو رہا ہے۔ اگلے صفحات میں ان شاء اللہ بالدلائل اس کی تفصیل پیش کی جائیگی ،جس سے پتہ چل جائیگا کہ ماضی کے انسان کے پاس دور جدید سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ ساز وسامان موجود تھا۔

ردم ذوالقرنین کا کام بھاری بھر کم لگنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان ردم ذوالقرنین کے کام کو اپنی حیثیت وطاقت کے معیار پر رکھ کر سوچتا ہے حالانکہ اسے یہ کام خالق کائنات کی طاقت کی سطح پر رکھ کر سوچنا چاہیے۔ جب اللہ خود فرمائے کہ ’’انا مکنا لہ فی الارض‘‘ تو ظاہر سی بات ہے کہ ذوالقرنین کوئی عام بندہ نہیں بلکہ غیر معمولی صلاحیت واختیار کا مالک ہے۔

ہاں کوئی پھر اشکال کرسکتا ہے کہ اگر یہ کام اللہ کا ہے تو پھر بندوں کے ذریعہ کروانے کی کیا ضرورت تھی ، وہ تو ’’کن فیکون‘‘ کا مالک ہے؟ یہ سوال ٹھیک اسی طرح ہے جیسے یہ کہا جائے کہ قرآن ، نبی ، رسول اور آیات آفاق وانفس میں غور کر کے ایمان لانے کی دعوت دینے کی کیا ضرورت ہے، خدا خود ہی اپنا دیدار کیوں نہیں کروا دیتا کہ ساری دنیا اس کا اقرار کرلے!

ان دونوں سوالوں کا ایک ہی جواب ہے، خدا اپنا دیدار کروانے پر بھی قادر ہے یا ایسی نشانی بھی بتلاسکتا ہے جسے دیکھ کر ہر کوئی ایمان لے آئے اور اس بات پر بھی قادر ہے کہ ہر چیز کن فیکون سے ہو جائے لیکن یہ دنیا امتحان کے مقصد پر قائم

ہے۔ دنیا میں آنے والے ہر کسی کے ایمان وعمل کا امتحان ہو رہا ہے چاہے وہ نبی ہو یا امتی، بادشاہ ہو یا فقیر، امیر ہو یا غریب، رعایا ہو یا حاکم، عام صلاحیت کا مالک ہو یا پھر طبیعیات، کیمسٹری اور ٹکنالوجی پر غیر معمولی دسترس رکھنے والا ذو القرنین جیسا شہنشاہ۔ الغرض واضح نشانیاں نہ بتلا کر پردۂ غیب میں رکھکر ''ایمان'' کا امتحان لیا جارہا ہے تو مختلف صلاحیتیں دیکر ''عمل'' کا۔

دوسری اہم بات یہ بھی ہے کہ قرآن میں وارد'' فأعينوني بقوة '' کے الفاظ پر جب ہم غور کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ بذات خود زبردست تصرفات و اقتدار کا مالک ہونے کے باوجود ذوالقرنین نے اس قوم سے افرادی قوت سے اعانت کی درخواست کی اور قرآن نے اس بات کو خاص مقام دیا، جس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ردم بنانے کا کام کوئی چھوٹا موٹا نہیں بلکہ نہایت غیر معمولی اور بہت بڑا تھا۔

برمیوڈا (Bermuda)، فلوریڈا (Florida) اور پیورٹو ریکو (Puerto Rico) کے مثلث کے درمیان یہ خطرناک علاقہ واقع ہونے کی وجہ سے اسے برمیوڈا تکون کہا جاتا ہے، لیکن اس کی صحیح حد بندی کیا ہے اور کتنے رقبہ پر اس کے اثرات ہیں، اسے محض اندازوں کے علاوہ ابھی تک صحیح بنیادوں پر ثابت نہیں کیا جاسکا۔

اس سوال کا ایک جواب یہ بھی ہے کہ یقیناً ردم کافی بڑے رقبہ پر مشتمل ہوگی لیکن ضروری نہیں کہ برمیوڈا ٹرائنگل کی ہولناکی والے اثرات جتنے بڑے

رقبہ پر مشتمل ہیں اتنی ہی بڑی ردم بھی بنائی گئی ہو، ہوسکتا ہے بلکہ یہی ہونا چاہیے کہ ردم کا علاقہ اس کے مقابلہ کافی چھوٹا ہو۔ بدیہی بات ہے کہ کیمیائی تعامل کے اثرات جتنے رقبہ پر پھیلے ہوتے ہیں اس کے مقابلہ متعامل علاقہ سینکڑوں ہزاروں گنا چھوٹا ہوگا۔

تاثیر ردم

ردم ذوالقرنین یعنی برمیوڈا ٹرائنگل میں آخر ایسا کیا ہے جس کی وجہ سے ایسے ہلاکت خیز اثرات پیدا ہورہے ہیں؟

سائنس دانوں کے لئے برمیوڈا ٹرائنگل کی ہولنا کی ایک معمہ بنی ہوئی ہے، ظاہری بات ہے کہ جب کوئی بھی انسان اس کے آس پاس پھڑک بھی نہیں سکتا تو پھر اس کی حقیقت کو کیسے واضح کیا جاسکتا ہے!۔ اس کی پراسراریت کو حل کرنے کے لئے آئے دن نت نئے نظریات پیش کئے جاتے رہتے ہیں لیکن کسی بھی دعوے کو سائنسی بنیادوں پر استوار نہیں کیا جا سکا۔ آیئے قرآن کے اس بیان کو سائنسی بنیادوں پر حل کرتے ہیں۔

مخصوص طور پر ایک دوسرے کے مساوی نصب کردہ لوہے کی جلتی (یعنی تابکاری کرتی) پلیٹوں اور سیال تانبے کے کیمیائی تعامل کے نتیجہ میں کیا ایسا ممکن ہے کہ وہاں اعلی درجہ کا ایسا کوئی اثر پیدا ہوجائے جو اس پر سے گذرنے والی ہر چیز کو اپنی تابکاری کے ذریعہ پاش پاش کرتے ہوئے اس کے وجود کو ہی ختم کردے؟

اگر ایسا ہوسکتا ہے تو پھر کیا یہ ممکن ہے کہ ہزاروں سال پہلے پیدا کردہ

کیمیائی تعامل آج تک جاری ہو اور لاعلی التعیین مدت تک جاری رہے؟

جو لوگ (Nuclear Fusion) جوہری ایئتلاف اور (Nuclear Fission) جوہری انشقاق کی اس تھیوری کو جانتے ہیں جس کی بنیاد پر ایٹم بم، ہائڈروجن بم اور (Nuclear Reactor) قائم کئے جا رہے ہیں، ان لوگوں کے لئے اس بات کو سمجھنا کوئی مشکل نہیں۔

۱۹۰۵ء میں نوبل انعام یافتہ مشہور سائنسداں آئنسٹائن نے ایک نظریہ پیش کیا تھا جو سائنسدانوں کے نزدیک نظریۂ اضافیت کے نام سے مشہور ہے۔ اس نظریہ کی ایک شق ($E=mc^2$) کی مساوات ہے۔

اس تھیوری کے مطابق مادہ انرجی میں بدل سکتا ہے اور انرجی مادے میں۔ یا یوں کہیے کہ مادہ توانائی ہے اور توانائی مادہ ہے۔

لاکھوں لوگوں کو آن واحد میں نیست و نابود کر دینے والے ایٹم بم اور ہائڈروجن بم کی صورت میں اس نظریہ کا عملی تجربہ ہمارے سامنے پیش آیا۔ یہ تجربہ یقیناً ایک تخریبی عمل تھا۔ لیکن اب سائنس داں نیوکلیر فیوژن کے نتیجہ میں حاصل ہونے والی غیر معمولی توانائی کو اسٹور کرنے کا کوئی ایسا طریقہ تلاش کرنے میں لگے ہوئے ہیں جس سے دنیا بھر میں بجلی کی کھپت کو آسانی سے دور کیا جا سکتا ہے۔

اس کو ایک مثال سے سمجھتے ہیں، ہم جو بجلی استعمال کرتے ہیں اس کے تین بڑے ذرائع ہیں۔ تھرمل پاور پلانٹ، ہائڈروالیکٹرک پاور پلانٹ اور نیوکلیر پاور پلانٹ۔

دہلی نے دس جولائی ۲۰۱۸ دوپہر ۳ بج کر ۲۸ منٹ پر ۷۰۱۶ میگھاواٹ (یعنی سات سوا ایک کروڑ، ساٹھ لاکھ واٹ) ریکارڈ بریک بجلی استعمال کی۔

اگر تھرمل پاور پلانٹ کے ذریعہ ایک ٹن کوئلہ کو بجلی حاصل کرنے کے لئے استعمال کیا جائے تو اس سے ۳۰۰۰۰ میگھاواٹ بجلی بنائی جاسکتی ہے، اس بجلی سے دہلی جیسے شہر کو محض چار سیکنڈ کے لئے بجلی فراہم کی جاسکتی ہے۔ دہلی میں بجلی کی کھپت ۷۰۰۰ میگھا جول فی سیکنڈ ہے۔ لیکن کوئلہ کو جلانے کے بجائے آئنسٹائن کی تھیوری کے مدنظر کوئلہ کے ماس کو ہی انرجی میں تبدیل کر دیں تو محض ایک کلو کوئلہ سے دہلی جیسے بجلی خور شہر کو (۱۴۸) دنوں تک کافی ہوسکنے والی بجلی فراہم کی جاسکتی ہے۔

نیوکلیئر ری ایکٹروں میں اسی تھیوری کے پیش نظر بجلی پیدا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، کسی حد تک کامیابی بھی ملی ہے لیکن ابھی اتنی کامیابی نہیں ملی کہ پورے کے پورے ماس کو انرجی میں تبدیل کر دیا جائے۔

یہ کہانی سنانے کا منشاء یہ ہے کہ ۱۹۰۵ء سے پہلے تک ہمارے ذہنوں میں یہی تصور پایا جاتا تھا کہ کوئی بھی جلتی چیز کو جب تک ایندھن ملتا رہے تب تک وہ جلتی رہتی ہے یا پھر ایک مدت جلنے کے بعد بجھ کر خاک ہوجاتی ہے لہذا یہ بات سمجھنی مشکل تھی کہ کسی چیز کا اتنی لمبی مدت تک کیمیائی تعامل جاری رہنا کیسے ممکن ہے، وہ بھی پانی کے اندر! لیکن آئنسٹائن کے نظریہ کے بعد یہ سمجھنا آسان ہوگیا کہ مادے میں بے پناہ توانائی موجود ہے، جسے مختلف ذرائع سے مختلف شکلوں میں خارج کیا جاسکتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ردم ذوالقرنین میں جلتے لوہے اور سیال تانبہ کا کیمیائی تعامل کس طرح جاری وساری ہے۔ کیا وہاں جلتے لوہے پر سیال تانبہ ڈالنے کے بعد خاص قسم کا نیوکلیر فیژن یا فیوژن کا عمل شروع ہو چکا ہے یا کسی مخصوص قسم کا ری ایکشن۔ وہ کونسی چیز ہے جو اسے لگاتار ایندھن فراہم کر رہی ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہاں تابکاری یا فیژن اور فیوژن کے علاوہ توانائی کے اخراج کی کوئی تیسری ہی شکل سرگرم ہو۔

''نار'' اور ''قطر'' کیا ہے؟

لفظ ''نار'' کی لغوی تحقیق کے دوران یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ نار بولتے ہیں ہمارے ذہنوں میں لکڑی، کوئلہ اور گیس جلنے کے نتیجہ میں ظاہر ہونے والے شعلے ہی آتے ہیں۔ قرآن نے ''نار'' کو اس معنی میں بہت کم جگہوں پہ استعمال کیا ہے، جبکہ زیادہ تر مقامات میں اسے حرارت و توانائی کے ساتھ تیز شعاؤں کے اخراج کے معنی میں استعمال کیا ہے جسے ہم یا اشعاع اور تابکاری کہہ سکتے ہیں۔

جبکہ ''قطر'' سے مراد عام طور پر ''سیال تانبہ'' لیا گیا ہے۔ درحقیقت اس سے مراد کوئی ایسی چیز ہے جو نار یعنی شعاع ریزی یا تابکاری جیسے عمل کو شدت کے ساتھ جاری رکھنے کا کام کرتی ہے۔

سورۂ کہف کی آیتوں میں ''نار'' اور ''قطر'' سے مذکورہ بالا معانی مراد ہونے پر سورہ رحمٰن کی مذکورہ ذیل آیتیں اور سورۂ سبا کی آیت وَأَسَلْنَا لَهُ عَيْنَ الْقِطْرِ ﴿سبا ۱۲﴾ بھی دلالت کرتی ہے۔

يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ إِنِ اسْتَطَعْتُمْ أَن تَنفُذُوا مِنْ أَقْطَارِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ فَانفُذُوا لَا تَنفُذُونَ إِلَّا بِسُلْطَانٍ (۳۳) فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ (۳۴) يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّن نَّارٍ وَنُحَاسٌ فَلَا تَنتَصِرَانِ (۳۵) ﴿الرحمن﴾

اے گروہ جن وانس اگر تم سیاروں اور زمین کے گھیراؤ کو چھید کر پار ہو سکتے ہو تو نکل دیکھو، چھید کر نہیں نکل پاؤ گے مگر (خدا کی) بادشاہی میں ۔۔۔۔۔۔تم پر آگ کی شعائیں اور آتش زن جو ہر چھوڑے جائینگے کہ تم مدد بھی نہیں مانگ پاؤ گے۔

الشواظ : بغیر دھوئیں کا شعلہ، آگ یا دھوپ کی گرمی۔ درحقیقت ''شواظ من نار'' ٹھیک وہ چیز ہے جسے موجودہ اصطلاح میں ہم حرارت و توانائی کے ساتھ تیز شعاؤں کا اخراج یا تابکاری کہتے ہیں۔

النحاس : تانبا، آگ، لوہے وغیرہ کو کوٹتے وقت جھڑنے والی چنگاری، بے شعلہ دھواں، طبیعت، ہر چیز کی اصل۔ نحاس کے ان معانی میں موجود قدر مشترک معنی پر غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ ''نحاس'' کوئی ایسا جوہر ہے جو چنگاری کا کام کرتا ہے۔

اہل لغت کے ذکر کردہ ''نحاس'' کے مذکورہ معنی اور سورہ رحمٰن کی مذکورہ آیت میں وارد ''شواظ من نار'' کے ساتھ ''یرسل اور فلا تنتصران'' پر غور کرنے سے ''پتہ چلتا ہے کہ نحاس وہ چیز ہے جو کسی چیز سے حرارت و توانائی کے ساتھ خارج شدہ شعاؤں کو شدت دینے کا کام کرتی ہے۔

یرسل (چھوڑنا، بوچھاڑ کرنا) کے لفظ پر غور فرمائیں، کیا اس آگ کو چھوڑا جا سکتا ہے جسے ہم جلاتے ہیں! ہرگز نہیں کیونکہ اس قسم کی آگ جلانے کے لئے

آکسیجن درکار ہے، اور خلا میں جس جگہ جانے سے قرآن انسان کو منع کر رہا ہے وہاں آکسیجن موجود ہی نہیں تو وہاں ایسی آگ چھوڑنے کا سوال ہی نہیں، بلکہ ہماری فضا جہاں آکسیجن موجود ہے اس میں بھی ایسی آگ پھینکنے پر ارسال کا لفظ استعمال نہیں ہوگا، لہٰذا پتہ چلا کہ شواظ من نار سے مراد وہ آگ نہیں ہوسکتی جسے ہم جلاتے ہیں بلکہ اس کا صحیح مصداق وہ تیزی سے نکلنے والی شعائیں ہیں جو کسی مادے سے حرارت وتوانائی کے ساتھ نکلتی ہیں۔ چنانچہ یُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّن نَّارٍ وَنُحَاسٌ میں ''شواظ من نار'' یعنی حرارت وتوانائی کے ساتھ خارج شدہ شعاؤں کے ساتھ ''نحاس'' یعنی ''آتش زن جوہر'' کو ایک ساتھ چھوڑنے کا مطلب یہ ہوگا کہ ان دونوں کے کیمیائی تعامل کے نتیجہ میں کچھ وہی نتائج پیدا ہونگے جسے ہم آج (Radiation) یعنی اشعاع کاری یا تابکاری کہتے ہیں۔

یرسل ۔۔۔فلا تنتصران: تابکاری کی یہ بوچھاڑ اس قدر شدید ہوتی ہے کہ جن وانس کو دیکھتے ہی دیکھتے اس طرح پاش پاش کر دیتی ہے کہ انسان کو کسی سے مدد لینے کا موقع بھی نہیں ملتا۔ بس ایسا ہی کچھ برمیوڈا ٹرائنگل یعنی ردم ذو القرنین میں ہو رہا ہے۔

تابکاری کیا ہے؟

علم طبیعیات کی رو سے (Radiation) یعنی تابکاری ایک ایسا مظہر ہے جس میں کسی جسم سے توانائی کی لہریں موجوں یا ذرات کی شکل میں خارج ہوتی ہیں۔

چلو دیکھتے ہیں کہ ردم ذو القرنین میں تابکاری کا یہ عمل کس طرح ہو رہا ہے؟

لوہا تقریباً ۱۵۰۰ درجہ حرارت پر پگھلتا ہے جبکہ تقریباً ۴۵۰۰ درجہ حرارت پر جلنے لگتا ہے، اب واقعۂ ذوالقرنین میں موجود ''حتیٰ اذا جعلہ نارا'' میں ''نار'' بنانے سے مراد ایسی آگ نہیں جس کا ہم لکڑی اور کوئلہ کے جلنے پر مشاہدہ کرتے ہیں، بلکہ یہاں وہی ''شواظ من نار'' یعنی تابکاری والی آگ مراد ہے۔

ذرہ ''جعلہ نارا'' کے اگلے پچھلے جملوں پر غور فرمائیں! ''سَاوٰی بَیۡنَ الصَّدَفَیۡنِ ''لوہے کی پلیٹیں اس طرح متوازی نصب کی گئی تھیں کہ درمیان میں قدرے خلا رہے۔ اب ''جَعَلَهٗ نَارًا '' کے بعد کے جملہ پر غور کریں۔ ''آتُوۡنِیۡ أُفۡرِغۡ عَلَیۡهِ قِطۡرًا '' مجھے سیال تانبہ لا دو تاکہ میں جلتی پلیٹوں کے درمیان موجود خلا کو بھر دوں۔ دیکھیے پلیٹوں کے درمیان ''خلا'' جلنے سے پہلے بھی تھا اور جلنے کے بعد بھی برقرار رہے، حالانکہ آگ دھونکنے کے نتیجہ میں نقطۂ پگھلاؤ (Melting Point) ۱۵۰۰ درجہ حرارت پر ہی پلیٹیں پگھل کر ڈھیر ہو جانی چاہیے تھیں، چہ جائیکہ کہ وہ (Burning Point) نقطۂ جلاؤ ۴۵۰۰ درجہ حرارت پر پہنچ کر جلنے کے قابل رہے!۔ پتہ چلا کہ لوہے کی پلیٹوں کو نار یعنی آگ بنانے کا مطلب یہ ہے کہ ان پلیٹوں کے ایٹموں کو اپنی قائم حالت میں ہی ''تابکار اور شعاع ریز'' بنا دیا گیا۔ یہ کیسے ہوا؟ اسی ذوالقرنین کی علم کیمسٹری کے نتیجہ میں جہاں تک موجودہ دور کی سائنس ابھی تک نہیں پہنچ پائی۔ اور اسی نکتہ کو بتلانے کے لئے'' جَعَلَهٗ نَارًا '' میں آگ جلانے کی نسبت ذوالقرنین کی جانب کی گئی ہے۔ حالانکہ جب لوہے کو دھونکنے کا کام قوم نے کیا تھا تو جلانے کی نسبت بھی قوم کی طرف ہی کرنی

چاہیے تھی۔

اب اس تابکاری کو شدت دینے اور تسلسل کے ساتھ قائم رکھنے کے لئے تابکاری دیتی پلیٹوں کے درمیان قطر یعنی سیال تانبہ ڈال دیا گیا۔ یہ سیال تانبہ انہیں جوہروں پر مشتمل ہے جن سے ''نحاس'' بنتا ہے۔

''قطر'' چنگاری لگانے والے اور بھڑکانے والے جوہروں پر مشتمل چیز کا نام ہے، اس بات پر سورۂ سبا کی آیت وَأَسَلۡنَا لَهُۥ عَيۡنَ ٱلۡقِطۡرِ بھی دلالت کرتی ہے۔

اب ذرہ ''آتُونِيٓ أُفۡرِغۡ عَلَيۡهِ قِطۡرٗا ﴿٩٦﴾'' کے جملہ پر غور فرمائیں کہ مجھے سیال تانبہ لادو تاکہ میں اس پر انڈیل دوں، یہ نہیں کہا کہ تم لوگ سیال تانبہ لاکر اس پر انڈیل دو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فَمَا ٱسۡطَٰعُوٓاْ أَن يَظۡهَرُوهُ وَمَا ٱسۡتَطَٰعُواْ لَهُۥ نَقۡبٗا ﴿٩٧﴾ کے پیش نظر لوہے کی جلتی پلیٹوں کے درمیان سیال تانبہ ڈالنے کے فوراً بعد وہ ردم بنکر تیار ہوجانے والی تھی جس کے ہلاکت خیز اثرات کا ہم آج مشاہدہ کررہے ہیں۔ اگر اس قوم سے سیال تانبہ انڈیلنے کا کام لیا جاتا تو وہ وہیں کی وہیں پاش پاش ہوکر نابود ہوجاتی۔ اسی لئے اس کام کی نسبت ذوالقرنین کی طرف کی گئی۔ یقیناً ان کے پاس کوئی ایسا زبردست قسم کا طیارہ یا سواری ہونی چاہیے جسے ردم کے یہ اثرات کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا: و آتیناہ من کل شیئ سبباً۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ردم ذوالقرنین کوئی جامد چیز نہیں بلکہ نیوکلئرری ایکٹر

کی طرح ایک ایسی جگہ ہے جہاں کیمیائی تعامل جاری وساری ہے، اب یہ کس طرح کا تعامل ہے، جوہری تعامل ہے یا کسی دیگر قسم کا، اس کی مزید وضاحت اہل علم وسائنس کر سکتے ہیں۔

قرآن نے تعمیر ردم میں تقسیم کار کو بتلاتے ہوئے صرف یہ بات ثابت نہیں کی کہ ذوالقرنین کو اللہ نے کیسی قدرت اور کس قدر عظیم الشان سواریاں عطا کی تھیں بلکہ ردم کے بنیادی اجزاء اور ان کے طریق عمل کو بیان کرنے سے اس بات کا اشارہ مل جاتا ہے کہ انسان بھی اس طریق عمل کو سمجھ کر اسے عملی جامہ پہنا سکتا ہے

اگر ردم کے اثرات کے پیچھے کارفرما طریق عمل سمجھ میں آجاتا ہے تو توانائی فراہم کرنے کا آسان ذریعہ بھی ہمیں ہاتھ لگ جائے گا اور انسانیت کا بھلا ہو جائے گا۔ ہاں انسان ایسا کر سکتا ہے، اسی لئے اس کے پروردگار نے پیشگی کہہ دیا ہے: وَأَنزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ۔ ہم نے لوہا اتارا ہے، اس میں بہت سخت قسم کی توانائی ہے اور لوگوں کے لئے منافع ہیں۔

کاش کہ دنیا اربوں کھربوں ڈالر خرچ کر کے یورینیم جیسے عناصر سے نیوکلیر ری ایکٹروں میں توانائی بنانے کی کوشش کرنے کی بجائے ''لوہے'' کی اہمیت کو سمجھے۔

الغرض تعمیر ردم کے متعلق میں نے اپنے ناقص علم کے مطابق کچھ باتیں پیش کرنے کی کوشش کی ہے، اس میں الفاظ قرآنی کے مفاہیم اور سائنسی اصطلاحات میں بہت کچھ ترمیمات کی گنجائش ہے۔ اگر اللہ نے چاہا تو مزید تحقیق

کے بعد الفاظ قرآنی کے صحیح ترین مفاہیم کے ساتھ ردم ذوالقرنین کے واضح سائنسی طریق عمل پر بھی کوئی بات پھر کبھی پیش کی جائیگی۔

یاجوج وماجوج کون ہیں؟

اب سوال یہ ہے کہ یاجوج وماجوج آخر کیسی مخلوق تھی کہ اس کی تکلیف سے بچنے کے لئے اتنی خطرناک ردم تعمیر کی گئی، بلکہ اللہ تعالیٰ نے قرب قیامت کی نشانیوں میں خروج یاجوج وماجوج کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے؟

اس سوال کا جواب سمجھنے کا مدار یاجوج ماجوج کی حقیقت سمجھنے پر منحصر ہے کیونکہ قرآن کے مطابق یہی وہ مخلوق ہے جس کے تباہ کن اثرات سے اہل زمین کو محفوظ رکھنے کے لئے یہ عظیم الشان ردم تعمیر کی گئی۔

جس طرح سد ذوالقرنین کے متعلق ذات بھانت کے اقوال ہر زمانے میں پیش کئے جاتے رہے اسی طرح یاجوج ماجوج کی حقیقت کے متعلق بھی عجیب و غریب قسم کی چہ میگوئیاں ہمیشہ بحث و مباحثہ کا موضوع رہی ہیں۔ بمطابق اسرائیلیات یاجوج وماجوج یافث ابن نوح علیہ السلام کی اولاد ہیں، اسی کی پیروی کرتے ہوئے تقریباً سبھی مؤرخین، مفسرین اور علماء اسلام نے بھی انہیں سفاک، ہلاکت خیز اور فسادی انسان کے روپ میں ہی دیکھا ہے؛ چنانچہ کوئی تاتاری قوم کو

یاجوج و ماجوج سمجھتا ہے، کوئی ترکوں کو، کوئی چینیوں کو تو کوئی یہودیوں کو یاجوج و ماجوج ثابت کرنے پر طرح طرح کے دلائل دیتا نظر آتا ہے۔

یاجوج و ماجوج کے متعلق ٹھوس دلائل پر مبنی مکمل تفصیل جاننے سے قبل ان کے بارے میں تاریخ اور احادیث کا حوالہ دیتے ہوئے مؤرخین و مفسرین نے جو تعارف پیش کیا ہے اس پر ایک نظر کرتے چلیں۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹے تھے سام، حام اور یافث۔ سام سے عرب نسل ہے، حام سے حبشی نسل اور یافث کی نسل سے دو قبیلے تھے جن میں سے ایک کا نام یاجوج اور دوسرے کا ماجوج ہے۔

یہ اولاد آدم ہی ہیں، انسانوں سے ماوراء کوئی مخلوق نہیں۔

یاجوج ماجوج نزول حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور خاتمہ فتنۂ دجال کے بعد خروج کرینگے۔

یاجوج و ماجوج کا مقابلہ کوئی بھی نہ کرسکیگا، حتیٰ کہ حضرت عیسی علیہ السلام بھی۔

ان کی تعداد مسلمانوں سے ننانوے فیصد زیادہ ہے۔

یہ سب بلا امتیاز جہنمی ہونگے۔

یاجوج و ماجوج آج بھی موجود ہیں، اور اپنے مقررہ وقت پر اللہ کے حکم سے قرب قیامت اہل دنیا پر وارد ہونگے، یہ وحشتناک، فتنہ، فساد اور ہلاکت و بربادی کا باعث بنینگے۔

یہ اپنے گرد بنی دیوار کو روزانہ چاٹتے رہتے ہیں اور جھلی برابر پتلی باقی رہنے پر پھر

اگلی صبح کے لئے چھوڑ دیتے ہیں کہ کل باقی کر لینگے لیکن اگلی صبح پھر جب اسے گرانے کے لئے آتے ہیں تو بحکم الٰہی وہ پھر اتنی ہی موٹی پاتے ہیں اور یہ عمل اس وقت تک جاری رہیگا جب تک کہ اپنے وقت موعودہ پر مشیت ایزدی سے ان شاء اللہ کہیں گے تب اگلی صبح وہ دیوار اتنی ہی پتلی پائینگے جتنی چھوڑ کر گئے تھے تو باقی گرا کر باہر نکل آئینگے اور وہ دنیا والوں پر جھپٹ پڑینگے۔

یہ دیوار سے باہر آکر دنیا کا تمام پانی یکلخت ختم کر دینگے، تمام سبزہ آن واحد میں کھا جائینگے، انسانوں، حیوانوں اور چرند پرند کا بے پناہ خون بہائینگے کہ کسی کو کہیں پناہ نہیں ملیگی، پھر وہ آسمان کی طرف تیر برسائینگے جو حکم الٰہی سے خون آلود ہو کر واپس آگرینگے تو یہ خوشی سے کہینگے کہ ہم نے دنیا والوں کو بھی تباہ کر دیا اور آسمان والوں پر بھی غلبہ حاصل کر لیا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام پھر دعا فرمائینگے تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے یاجوج و ماجوج کی گردنوں میں کیڑے پیدا ہو جائینگے اور وہ تمام ہلاک ہو جائینگے۔

انکی ہلاکت کے بعد دنیا پر صرف مسلمان ہی باقی رہینگے، پھر یہ مسلمان کفر و شرک، بد اعمالیوں میں مبتلا ہو جائینگے تو ان میں سے اللہ تعالیٰ نیک لوگوں کو اٹھا لینگے اور برے لوگوں پر قیامت قائم کرینگے۔

لیکن ان مذکورہ باتوں میں کس قدر سچائی ہے اسے دلائل کی بنیاد پر جانچنا ضروری ہے۔ کیا یاجوج و ماجوج انسان ہیں یا کوئی دیگر مخلوق، کیا وہ کسی شریعت کے پابند ہیں یا پھر غیر مکلف مخلوق، کیا واقعتاً وہ کوئی فسادی مخلوق ہے یا اللہ کا عذاب

، وہ سطح زمین پر آباد ہیں یا کہیں اور؟ اس طرح کے کئی سوالات ہیں۔ آیئے دیکھتے ہیں اس بارے میں قطعی دلائل ہماری کیا رہنمائی کرتے ہیں۔

یأجوج و مأجوج کی وجہ تسمیہ

لفظ یأجوج و مأجوج کے معنی ، مادے ، وزن اور انکی اصلیت کے متعلق آج تک کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا جاسکا، یہی وجہ ہے کہ انکی وجہ تسمیہ کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکا کہ اس مخلوق کو آخر یأجوج و مأجوج کیوں کہا جاتا ہے۔

کسی نے یأجوج و مأجوج کو عربی الاصل ماننے کے بجائے عجمی الفاظ قرار دیتے ہوئے (Gog Magog) سامی زبان میں انکی اصل بتلانے کی کوشش کی ہے

کوئی یأجوج و مأجوج کے الف کو زائد مانتے ہوئے یجج اور مجج سے فاعول کے وزن پر یاجوج و ماجوج بتلاتا ہے۔

کوئی انہیں أج الماء اور مجت النار سے مشتق ہونے کا قائل ہے۔

جو لوگ یأجوج و مأجوج کے ہمزہ کو اصلی گردانتے ہیں وہ اسے ''أج الماء '' سے مشتق مانتے ہیں۔ اور تانیث وعلمیت کی بنا پر غیر منصرف۔

ویَفْعُول یَأْجُوج فیمن ھمز فأما مأْجُوج فیمن ھمز فمفعول من أَجَّ ومن لم یھمز ففَاعُول من مَجَّ أو فَعْلول من ماج وأبدل من الواو ألفاً أو من مأج فترك الھمز۔

یأجوج و مأجوج کا حقیقی معنی

یأجوج و مأجوج دونوں عربی الفاظ ہیں ، اول یفعول کے وزن پر

صفت مشبہ جبکہ دوسرا مفعول کے وزن پر اسم مفعول، اور ''علم مرکب'' ہونے کی بنا پر غیر منصرف ہے۔ آیئے الفاظ کا حقیقی معنی و مفہوم سمجھنے سے پہلے انکی صرفی تحلیل پر غور کر لیں۔

أج، يؤج، أجيجا (باب نصر ينصر)، صفت أجّاج و أجوج (بھڑکنا)

أج الماء: پانی کا کھاری ہونا

أجت النار: آگ بھڑکنا

أج الامر: مشتبہ ہو جانا

الأَجُّ: السُّرعَةُ. أَجَّ الظليم يؤج أجّاً، أى عدا وله حفيف فى عَدْوِه كحفيف اللهب. قال الشاعر: تؤج كما أَجَّ الظليمُ المُنَفَّرُ۔

أجيج: أجيج الماء، (پانی گرنے کی آواز)، أجيج النار، (آگ جلنے کی آواز) تَلَهُّب النار

أجاج: ماءٌ أُجاجٌ، أى مِلْحٌ مرّ بہت کھارا اور کڑوا پانی (الأُجاج: ما يلْذَع الفم بمرارته أَو مُلوحته.)

أجّاج: دہکتا بھڑکتا، شعلہ زن

أجوج: مصباح أجوج (روشن چراغ) المُضِيءُ النَّيِّر (أَغَرُّ كمصباح اليهودِ أَجوجُ)

أجة: اشتدت أجة المصيف (گرمی کی شدت) شدة الحر وتوهُّجه، سمعت أجة القوم: حفيف مشيهم واضطرابهم.

وأَجَجَ كمَنَعَ: حَمَلَ علی العَدُوِّ (القاموس)

ماقبل میں یہ بات بیان ہوچکی ہے کہ قاعدۂ لغت عربی کے مطابق صلات یا فاعل کے بدلنے سے بھلے معانی میں اختلاف پیدا ہوجائے، پھر بھی ان میں ایک قدر مشترک معنی ضرور ہوتا ہے۔ چنانچہ مذکورہ بالا کلمات کے مفہوم میں بنیادی طور پر شدت کے ساتھ بھڑکنا اور اچھلنا جیسا معنی پایا جاتا ہے لیکن اصولی طور پر یہ بھڑکنا ایک مخصوص کیفیت کا حامل ہوتا ہے جس میں ''ایک جاری و متحرک چیز کو دوسری چیز اپنی طاقت سے دھکا دے کر واپس دھکیل دیتی ہے، اس فعل وانفعال کے نتیجہ میں آواز کے ساتھ (آگ، پانی اور مٹی جیسی چیز کا چھڑکاؤ کی شکل میں) مخصوص قسم کا ملا جلا ردعمل کا جو ظہور ہوتا ہے'' اسی کیفیت کو ''أج، یؤج'' بیان کرتا ہے۔

جو چیز ٹکرا کر اس قسم کا اثر پیدا کرے وہ ہوگی ''یأجوج'' اور جس سے ٹکرا کر یہ نتیجہ برآمد ہوا سے '' مأجوج بہ'' اور اس ٹکر یا ملاپ کے نتیجہ میں جو کیفیت اور اثر پیدا ہوا سے أجیج ،أجة یا أجاج کہا جائیگا۔

آیئے تھوڑی وضاحت کرتے ہیں کہ کس طرح یہ معنی قدر مشترک کے طور پر مذکورہ الفاظ میں پایا جاتا ہے۔

أجیج الماء: پانی کی آواز۔ جب تیزی سے بہتا ہوا پانی کسی چٹان سے ٹکراتا ہے، یا کسی آبشار سے گرتا پانی پتھر سے ٹکرا کر آواز کرتے ہوئے اچھلتا ہے، تو اس کیفیت کو بیان کرنے کے لئے أجیج الماء بولا جاتا ہے۔

أج الظليم المنفر : تیز رفتار گھوڑے کا بدک جانا۔ تیزی کے ساتھ دوڑتا

گھوڑا جب کسی وجہ سے بدک کر پیچھے کی طرف آواز کرتے ہوئے ہٹنے کی کوشش

کرنے لگے تو اس وقت ’’أج‘‘ کے استعمال کا صحیح موقع ہے۔

أجة : اشتدت أجة المصیف : موسم گرماں کی لہر شدید ہوگئی۔ ہر قسم کی

گرمی کی شدت کے وقت اجة کا استعمال درست نہیں ہوگا، بلکہ جب موسم گرماں

میں عرب جیسے صحرائی علاقوں میں سورج کی کرنیں ریتیلی میدان سے ٹکرا کر ایسی گرم

ہواؤں کی لہر اور لپٹ پیدا کرتی ہیں جو پانی اور درختوں تک کو خشک کر دیتی ہیں۔

گرمی کی ایسی لہر اور لو کو’’ اجة المصیف‘‘ بولا جائیگا۔ مثلاً وقال ذُو الرُّمَّة :

حَتیٰ إِذا مَعْمَعَانُ الصَّيْفِ هَبَّ لَهُ... بأَجَّةٍ نَشَّ عَنْها المَاءُ والرُّطَبُ۔

أجت النار : ہر قسم کی بھڑکتی آگ کے لئے أج کا استعمال نہیں ہوگا بلکہ مسلسل

ایک رفتار سے جلتی آگ میں جب وقفہ وقفہ سے تڑ تڑ کی آواز کے ساتھ شعلے

بھڑکتے رہیں تو ایسی آگ کو’’ أجت النار‘‘ کہا جائیگا۔ جیسے باتت النار تؤج

تحتی سریرتی۔

مذکورہ مثالوں میں ’’ أج ‘‘ کا قدر مشترک معنی تو سمجھ میں آ گیا لیکن أج

الماء (پانی کھارا ہو گیا) میں یہ قدر مشترک معنی نہیں نظر آتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ

أج الماء کا معنی ’’ پانی کھارا ہو گیا‘‘ کرنا درست نہیں۔

دراصل قرآن کریم میں تین مقام پر واقع ’’أُجَاجٌ‘‘ کا معنی بیان کرنے

میں اہل لغت و تفسیر سے وہی چک ہو گئی ہے جو حمئة کے معنی بیان کرتے وقت

ہوئی تھی۔

وَهُوَ الَّذِي مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَهٰذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ﴿۵۳ الفرقان﴾
وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرَانِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَائِغٌ شَرَابُهُ وَهٰذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ ﴿۱۲
فاطر﴾

مذکورہ آیتوں میں واقع لفظ ''اُجاج'' کا معنی بیان کرتے ہوئے اہل معاجم ولغت اور مفسرین نے بیک زبان جولکھا ہے وہ ہے: شدید المرارۃ (یعنی پانی کا نہایت کڑوا ہونا)، شدید الملوحۃ (یعنی پانی کا نہایت کھاری ہونا) یا کڑوا اور کھاری ہونا دونوں ایک ساتھ بھی مراد لئے جاسکتے ہیں۔ یا پھر بقولے'' شدید الحرارۃ''۔ ملاحظہ فرمائیں۔

(و) يقال: (ماءٌ أُجَاجٌ) بالضّمّ، أي (مِلْحٌ)، وقيل: (مُرٌّ)، وقيل: شَدِيدُ المَرارةِ، وقيلَ: الأُجاجُ: الشَّدِيدُ الحَرارةِ وكذالك الجَمْعُ، قال الله عزّ وجلّ: { وَهَاذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ } (سورة الفرقان، الآية: ۵۳) وهو الشّديدُ المُلُوحَةِ والمَرَارَةِ، مثل ماءِ البحر، وفي حديث عليّ (عَذْبُها أُجَاجٌ). وهو الماءُ المِلْحُ الشديدُ المُلُوحَةِ. تاج العروس ولسان العرب۔

لیکن اگر اصولی طور پر براہ راست دیکھا جائے تو ان میں سے کوئی بھی معنی درست نہیں کیونکہ

نمبر ایک: آیت مِلْحٌ أُجَاجٌ میں ملح کا معنی کھارا ہے، اگر اُجاج کا معنی بھی ''بہت زیادہ کھارا ہونا'' لیا جائے تو الفاظ کی لایعنی تکرار لازم آتی ہے۔

نمبر دو: اُجاج فعال کے وزن پر اسم مرہ ہے نہ کہ صفت مشبہ

نمبر تین: قرآن میں کہیں بھی کسی چیز کی حالت کو بیان کرتے وقت کسی قسم کی مبالغہ آرائی نہیں پائی جاتی، اگر اُجاج کا معنی شدید الملوحۃ یا شدید المرارۃ کیا جائے تو یہ بے جا مبالغہ آرائی ہوگی کیونکہ سمندر کے پانی میں اس قسم کی سخت کڑواہٹ یا کھارا پن نہیں پایا جاتا۔

آیت کا صحیح ترجمہ ہے: وَهُوَ الَّذِي مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هَٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَهَٰذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ ﴿۵۳ الفرقان﴾ اور (اللہ) ہی ہے جس نے دو سمندر بہائے، ایک کا ذائقہ ایسا میٹھا ہے جو من کو بھاتا ہوا گلے سے اتر جاتا ہے اور دوسرا ایسا کھارا ہے جو جھٹ سے تھوک دیا جائے۔

گویا ''منہ میں جاتے ہی کھارے پن کی وجہ سے زبان پوری طاقت سے جس پانی کو باہر پھینک دے، اسے مِلْحٌ أُجَاجٌ کہا جائیگا۔

الغرض ہر وہ چیز (چاہے وہ پانی ہو یا کوئی اور چیز) جسے بدذائقہ ہونے کی وجہ سے منہ جھٹ سے پھینک دے، اسے أُجَاجٌ کہا جائیگا، صرف کھارے پن پر اس کا اطلاق نہیں ہوگا۔ اسی طرح ضروری نہیں کہ صرف منہ سے اوکی گئی چیز پر ہی اُجاج ہو بلکہ کسی مناسب جگہ پر بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔

مذکورہ آیت میں'' أجاج '' کا مقابل لفظ'' فرات '' ہے، لوگوں نے فرات کا معنی بھی ''میٹھا پانی'' کر دیا ہے، یہاں بھی وہی خرابی لازم آتی ہے جو ملح أجاج کا ترجمہ'' نہایت کھارا'' کرنے میں تھی، چنانچہ آیت مذکورہ میں عذب فرات کا معنی ''نہایت میٹھا'' کرنا درست نہیں بلکہ صحیح ترجمہ ہے'' ایسا میٹھا جو بغیر

کسی رکاوٹ کے گلے سے فورا اتر جائے''۔ اسی لئے قرآن نے سائغ شرابہ سے عذب فرات کی مزید وضاحت کردی ہے۔

الأشیاء تعرف بأضدادہ کے تحت اگر ہم ''فرات'' کا معنی سمجھ لیتے ہیں تو ''أجاج'' کا معنی سمجھ میں آجاتا ہے اور اگر ''أجاج'' کو سمجھ لیتے ہیں تو ''یأجوج و مأجوج'' کا مفہوم سمجھ میں آجاتا ہے۔

فرت، یفرت، فرتا و فروتۃ۔ باب نصر سے بدکار ہونا۔ باب سمع سے کم عقل ہونا۔ باب کرم سے میٹھا ہونا۔

لغت عربی میں ایک مفہوم کو بیان کرنے کے لئے بے شمار الفاظ ہوتے ہیں تو دوسری جانب ایک لفظ کے بے شمار معانی بھی نکل سکتے ہیں ۔لیکن علم اصول کلمات کے مطابق اگر غور کیا جائے تو جن کلمات کو مترادفات کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے ان میں سے ہر لفظ کا ایک مخصوص معنی ہوتا ہے ۔ بدکار ہونے، کم عقل ہونے اور میٹھا ہونے کو بتلانے والے بے شمار الفاظ ہیں، ہر ایک کی اپنی خصوصیت ہے، چنانچہ ''فرت'' سے بننے والے مشتقات کے مفاہیم میں اختلاف ابواب کے باوجود ایک قدر مشترک معنی ہے، وہ ہے ''من پسند فعل بغیر کسی رکاوٹ کے انجام پذیر ہونا''

فرت: بدکار ہونا۔یعنی بغیر کسی مانع و رکاوٹ کے زنا کاری میں مبتلا رہنا۔

فرت: کم عقل ہونا۔یعنی ہر اس بات کو بغیر ردو قدح کے مان لینا جو اپنی راے کے مطابق ہو۔

فرت: میٹھا ہونا۔ یعنی ایسی ذائقہ دار چیز جو من کو بھاتی ہو، چنانچہ پانی کا جو گھونٹ ذائقہ دار ہونے کی وجہ سے گلے سے فوراً اتر جائے اسے ''فرات'' کہا جائیگا۔

ٹھیک ''فرات'' کی ضد ''اُجاج'' ہے یعنی ایسا بد ذائقہ پانی جو گلے سے اپنی کھارے پن کی وجہ سے اتر نہ پائے بلکہ منہ کے اعصاب فوری ردعمل کرتے ہوئے اسے تھوک دے۔

أج یؤج کا لغوی معنی تو ہم جان چکے ہیں، لیکن یاجوج کا وزن یعنی ''یفعول'' بھی اس کے معنی کی صحیح رہنمائی کرنے میں کافی اہمیت کا حامل ہے۔

''یفعول'' کے وزن کے متعلق ہمیں کتب صرف میں کوئی خاص تذکرہ نہیں ملا کہ آخر یہ وزن کس طرح مشتق ہوتا ہے اور اسکی کیا خاصیت ہے۔ وزن'' یفعول'' کی خاصیت کی جانچ پڑتال کے لئے اگر معاجم ولغات میں نظر کی جائے تو مذکورہ ذیل الفاظ نظر آتے ہیں۔

یأموم: کبوتر کا چوزہ ،

یعسوب: شہد کی مکھیوں کی رانی، ایک چھوٹا پرندہ، قوم کا سردار

یعفور: ہرن

یأفوخ: نومولود بچے کے سر کا وہ حصہ جو حرکت کرتا ہے

یأفوف: بزدل، بے عقل، تیتر کا بچہ، کڑوا کھانا، تیز رفتار

یربوع: ایک قسم کا چھوٹا چوہا (چوہے کے مانند ایک جانور جس کی اگلی ٹانگیں چھوٹی، پچھلی بڑی اور دم لمبی ہوتی ہے)

یحمور : چھوٹی دم والا بارہ سنگھا، گاوخر

ینبوت: ایک قسم کی تیزی سے اگنے والی نبات

یهفوف : یزدل، بزدل، چٹیل زمین

ینبوع پانی کا چشمہ

یعبوب تیز رفتار لمبا گھورا، تیز رونہر

یحموم سیاہ چیز، کبوتر کی ایک قسم جس کا پیٹ، گردن، سر اور سینہ سیاہ ہوتا ہے، چونچ

اور پیر چھوٹے ہوتے ہیں۔

یعقوب: نر چکور

یَسْرُوع : دُوَیبَّة تکون فی الرمل

یمْخور : عنق طویل

یَعْمور : ضَرب من الطیر

یهْمور : الماء الکثیر (تیزی سے گرنے والا)

ظبی یَنْفور : شدید النفرة والقفز

یَنْخوب : جبان

دَیْجور : ضرب من الظباء

یَحْبور : طائر

أرض یَخْضور : کثیرة الخضرة (تیزی سے اگنے والی)

ثوب یَعْلول : إذا عُلَّ بالصِّبْغ مرة بعد أخری

طریق یَنْکوب علی غیر قصد (نیچے کی طرف جاتا راستہ)

یَرْمُوق: ضعیف البصر (جسکی آنکھیں پھڑ پھڑاتی رہتی ہوں)

اب ان مذکورہ الفاظ کے اصلی معانی پر غور کیا جائے تو چند باتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں۔

۱۔ یفعول کا وزن اسم اور صفت دونوں کے لئے مستعمل ہے۔ اسماء جیسے یعقوب، یرموک، یعسوب، یربوع۔ صفات جیسے الیحموم، الیخضور، الیرقوع۔

۲۔ دوسری خاص بات جو یفعول کے وزن میں پر نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ یفعول کے وزن پر واقع تمام اسماء وصفات فعل لازم سے بنے ہیں، ان میں ایک بھی ایسا اسم نہیں جو فعل متعدی سے بنا ہو۔

یفعول کا وزن فعل لازم سے بننے کے علاوہ اس میں صفت کے ثبوت ودوام کا معنی بھی پایا جاتا ہے، لہذا یفعول کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ یہ ''صفت مشبہ'' کا ہی ایک وزن ہے۔

۳۔ اگر ان الفاظ کے معانی کو بغور دیکھا جائے تو وزن یفعول کے معنی میں جو چیز قدر مشترک نظر آتی ہے، وہ ہے: ''کسی خاص وجہ سے کسی چیز کا مسلسل حرکت میں ہونا، یا نسبتاً زیادہ متحرک ہونا''۔ یہ خاص وجہ کمزوری بھی ہوسکتی ہے جیسے یهفوف: تیز دل، بزدل۔ یأفوخ: نومولود بچے کے سر کا وہ حصہ جو حرکت کرتا ہے۔ یأفوف، بزدل، بے عقل، تیتر کا بچہ، کڑوا کھانا، تیز رفتار۔

یا ڈھلوان جیسی وجہ بھی ہوسکتی ہے۔ جیسے طریق یَنْکوب: نیچے کی طرف جاتا راستہ۔ یعبوب: تیز رفتار لمبا گھورا، تیز رو نہر۔ ینبوع: پانی کا چشمہ۔

یا حرکت کی وجہ کام میں سرگرمی دکھانا بھی ہو سکتی ہے جیسے یعسوب : شہد کی مکھیوں کی رانی، قوم کا سردار۔ وغیرہ وغیرہ

الغرض ''یفعول'' کے وزن میں ''اضافی حرکت'' کا معنی پایا جاتا ہے، اس حرکت کی وجہ کوئی بھی ہو سکتی ہے۔

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے یاجوج و ماجوج ایک متحرک مخلوق ہے لیکن ان میں سے یاجوج نسبتاً زیادہ متحرک مخلوق ہونی چاہیے۔ شاید ان کی حرکت کی وجہ زمین کے اوپر نکلنے کی کوشش بھی ہو۔

لفظ یاجوج کی صرفی تحلیل واضح ہو چکی ہے جبکہ ماجوج کو بعض اہل معجم نے أج الماء (فعل متعدی) سے مفعول قرار دیا ہے، حالانکہ یہ بات درست نہیں چونکہ أج یؤج فعل لازم ہے جیسا کہ ماقبل میں یفعول کی بحث میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے۔ فعل لازم سے مفعول بنانے کے لئے اس کے بعد جار مجرور لانا ضروری ہے، ہاں البتہ جب کسی قسم کا اشتباہ نہ رہے یا متعدی بحرف جار بصورت اسم استعمال ہو تو ایسی صورت میں جار مجرور کا حذف کرنا بھی درست ہے۔ جیسے

حساب مَغْلُوط فيه کی بجائے حساب مَغْلُوط بولا جائے

هذا أمر مَنْدُوب إليه کی بجائے هذا أمر مَنْدُوب بولا جائے

من المتعَيَّن عليه حدوث السلام کی بجائے من المتعَيَّن حدوث السلام بولا جائے

كان كالمحجور عليه لا يملك من أمره شيئًا کی بجائے كان كالمحجور لا

یملك من أمرہ شیئًا بولا جائے

طریق مُشْتَرَكٌ فیه کی بجائے طریق مُشْتَرَكٌ بولا جائے

ٹھیک اسی طرح یأجوج و مأجوج بھی اصل میں یأجوج و مأجوج به ہے، بصورت ''علم مرکب'' استعمال ہونے کی وجہ سے جار مجرور کو حذف کر دیا گیا، اس کے علاوہ صیغہ کی لفظی و معنوی خصوصیت بھی بتلاتی ہے کہ یہاں پر ''به'' جار و مجرور ساقط ہونا چاہیے۔

خلاصۂ کلام

یاجوج و ماجوج ایک زیر زمین رہنے والی مخلوق ہے۔ دونوں میں سے یاجوج نسبتاً زیادہ متحرک ہے۔ جب یاجوج ماجوج سے ٹکراتا ہے یا آمنے سامنے ہوتا ہے تو ایک قسم کی بھڑک پیدا ہوتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ بھڑک کس قسم کی ہے، آگ جیسی کوئی چیز ہے یا پانی کو اچھالا دیتی ہے۔ یہ سوال ابھی حل طلب ہے۔

یاجوج و ماجوج کی ہیئت و حقیقت؟

اگلی سطور میں علماء مؤرخین اور مفسرین کی آراء درج ہو چکی ہیں، جنکے مطابق یاجوج و ماجوج کسی دیوار کے پیچھے محصور انسانی نسل سے تعلق رکھنے والی ایک قوم ہے۔ کسی کا کہنا ہے کہ یاجوج ان میں مذکر ہیں جبکہ ماجوج مؤنث۔ قد کے متعلق بھی مختلف رائیں پائی جاتی ہیں، کوئی انہیں بہت زیادہ لمبا بتلاتا ہے تو کوئی بالشت جتنا بونہ۔

دلائل کی رو سے یاجوج وماجوج زیر زمین رہنے والی اور باہر نکلنے کے لئے
ہردم کوشاں ومتحرک ایک مخلوق ہے۔وجوہات حسب ذیل ہیں۔

نمبرایک: یاجوج وماجوج کے زیر زمین رہنے والی مخلوق ہونے پر سب سے بڑی
دلیل خود ''ردم'' ہے، اگر یاجوج وماجوج زمین کے اوپر بسنے والی کوئی مخلوق ہوتی تو
اس قسم کی ردم بنا کر منفذ کو بند کردینے کی بات نہ کی جاتی۔

نمبر دو: اگر یاجوج وماجوج انسان ہوتے تو بین السدین رہنے والی قوم ذوالقرنین
سے ''سد'' بنانے کی درخواست نہ کرتی بلکہ انہیں ہلاک کرنے کا مطالبہ کرتی کیونکہ
اِفساد انسانی ظلم کے دائرے میں آتا ہے، چنانچہ جس طرح قوم اول سے ملاقات
کے وقت پیغام خداوندی سنانے کے بعد ذوالقرنین نے فرمایا تھا کہ جو ظلم کریگا
اسے ہم سزا دینگے۔ لہٰذا یاجوج وماجوج بھی اگر انسان ہوتے تو ردم بنا دینے کی
بجائے انہیں ختم کردیا جاتا۔

نمبر تین: یاجوج وماجوج انسانوں کے لئے ہلاکت خیز مخلوق ضرور ہے لیکن مفسد
نہیں۔قرآن میں یاجوج وماجوج کو'' مفسدون فی الأرض '' جو کہا گیا ہے وہ
دراصل حکایتاً عن القوم ہے۔ یاجوج وماجوج کا خروج دراصل انسانوں کے لئے
عذاب ہے اور عذاب افساد کے دائرے میں نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ یاجوج و
ماجوج کے متعلق قرآن میں کہیں بھی عذاب، وعدووعید یا حشر کا تذکرہ موجود نہیں،
وعدووعید صرف ثقلین یعنی جن وانس کے لئے ہی ہے۔

ایک سوال

یہاں کسی کو یہ سوال ہوسکتا ہے کہ جب یاجوج وماجوج انسان نہیں بلکہ کوئی اورمخلوق ہےتو ان کے لئےضمیر ذوی العقول کیوں استعمال کی گئی ؟

انسان کی طرح کسی اختیاری عمل یا انسانوں کے ساتھ مخصوص کسی فعل کو بجالانے کی وجہ سے غیر ذوی العقول کے لئے بھی کبھی ضمیر ذوی العقول استعمال کی جاتی ہے۔ کلام عرب میں یہ بات عام ہے، اور قرآن میں اس کی کافی مثالیں موجود ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

قَالَتْ نَمْلَةٌ يَا أَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوا مَسَاكِنَكُمْ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمَانُ وَجُنُودُهُ وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿١٨ النمل﴾

إِنِّي رَأَيْتُ أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَأَيْتُهُمْ لِي سَاجِدِينَ۔

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ۔

یاجوج وماجوج کی تباہ کاری: فساد یا عذاب

بین السدین قوم نے یاجوج و ماجوج کے متعلق شکایت کرتے ہوئے انہیں ''مفسدون فی الارض'' بتلایا تھا۔

افساد کیا ہے؟ قرآنی اصطلاح کے مطابق اللہ کے قائم کردہ نظام میں خلل پیدا کرنا افساد فی الارض کہلاتا ہے۔ چاہے وہ انسانوں کا ناحق قتل ہو، کھیتی باڑی اور مویشی کو برباد کردینا ہو، یا کسی دیگر قسم کا بگاڑ۔

الفساد: خروج الشیء عن الاعتدال، قلیلا کان الخروج عنه أو کثیرا، ویضاده الصلاح، ویستعمل ذلك فی النفس، والبدن، والأشیاء الخارجة عن الاستقامة، یقال: فسد فسادا وفسودا۔

بین السدین قوم کا تعارف کرواتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا:

لا یکادون یفقھون قولا ۔ ذوالقرنین کی ملاقات ایک ایسی قوم سے ہوئی جو کسی بات کو سمجھنے کو تیار نہیں تھی ، یعنی نہ کبھی آفاق و انفس کی نشانیوں سے سبق لینے کی کوشش کی ، نہ انبیاء ورسل کی باتیں سنیں ، نہ اقوام ماضی کی داستانوں سے عبرت لی اور نہ ہی بشکل عذاب وارد یاجوج وماجوج کے خروج کو اپنے کیئے کی سزا سمجھا۔

قانون خداوندی کے مطابق کسی قوم کو متنبہ کرنے کا آخری طریقہ اپنے کیئے کی سزا کے طور پر عذاب میں مبتلا کرنا ہے، چنانچہ یاجوج وماجوج کا خروج اس قوم کے لئے اسی قسم کا عذاب تھا،لیکن اس عذاب سے عبرت لیکر اللہ وحدہ کا اقرار کرنے کی بجائے وہ انہیں مفسد فی الارض سمجھتی رہی ، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے انہیں ’’ قوما لا یکادون یفقھون قولا ‘‘ فرمایا۔

مفسرین نے اس جملہ کا ترجمہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ذوالقرنین ایسی قوم سے ملے جو کسی بات کو سمجھ نہیں پاتی تھی ۔ یعنی وہ نہایت پسماندہ تھی اور بغیر ترجمان کے ان سے بات کرنا دشوار ہورہا تھا۔

کاد ،یکاد کسی فعل کے ورود میں فاعل کے اختیار کو ظاہر کرتا ہے ۔ جس فعل میں فاعل کے اختیار کو دخل نہ ہو اس پر کاد، یکاد داخل نہیں ہوسکتا ۔ یعنی اس آیت کا یہ ترجمہ کسی طرح نہیں ہوسکتا کہ وہ قوم کوئی بات سمجھ نہیں سکتی تھی ، بلکہ ترجمہ ہوگا: وہ قوم کوئی (نصیحت کی) بات سمجھنے کو تیار نہیں تھی ۔ قرآن میں ہو بہو اس کی نظیر موجود ہے ۔ لا یکادون یفقھون حدیثا ۔

الغرض: یاجوج وماجوج کے ملاپ یاٹکر کے نتیجہ میں آخروہ کونسا ردعمل ظاہر ہوتا تھا جونوع انسانی کے لیےاس قدر ہلاکت خیز تھا اور جسے بین السدین قوم نے فساد سمجھ رکھا تھا، اس تباہی کا تعلق کس چیز سے تھا؟ اس تباہی کا تعلق کھیتی اور مویشی کو برباد کرنے سے تھا، انسانوں کی ہلاکت سے یا کچھ اور؟

اس سوال کا جواب دینے سے پہلے مزید ایک سوال حل کر لیتے ہیں کہ قرب قیامت یاجوج وماجوج کہاں سے نکلینگے؟

یاجوج وماجوج کا خروج زمین کے کس حصہ سے ہوگا؟

حَتَّىٰ إِذَا فُتِحَتْ يَأْجُوجُ وَمَأْجُوجُ وَهُم مِّن كُلِّ حَدَبٍ يَنسِلُونَ (٩٦) وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَإِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ أَبْصَارُ الَّذِينَ كَفَرُوا يَا وَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هَٰذَا بَلْ كُنَّا ظَالِمِينَ (٩٧) الأنبياء

یہاں تک کہ جب یاجوج وماجوج کھول دئے جائینگے، حال یہ ہوگا کہ وہ محدوب علاقے کی ہر طرف سے ایک دوسرے کی جانب دوڑے چلے آئینگے۔ اور اس طرح سچے وعدے کا وقت قریب ہو چکا۔۔۔

یہاں چند نکات ترتیب وار سمجھتے ہیں

الف۔ سورۂ کہف کی آیت قَالَ هَٰذَا رَحْمَةٌ مِّن رَّبِّي ۖ فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ رَبِّي جَعَلَهُ دَكَّاءَ ۖ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّي حَقًّا ﴿٩٨﴾ میں ردم کے متعلق ذوالقرنین نے امید ظاہر کرتے ہوئے وضاحت کردی تھی کہ یوم قیامت تک اسے کچھ بھی نہیں ہوگا، بلکہ وہ جیسی ہے ویسی ہی رہیگی، ہاں روز قیامت اللہ تعالیٰ اسے دکاء یعنی تہس نہس کر

دینگے۔ دوسری جانب سورۂ انبیاء کی مذکورہ بالا آیت نمبر ۹۶ اور ۹۷ سے پتہ چلتا ہے کہ یاجوج و ماجوج قرب قیامت یعنی قیامت سے پہلے کھول دئے جائینگے ۔جیسا کہ مذکورہ بالا آیت سے واضح ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ جب ردم کو قیامت تک کچھ بھی ہونے والانہیں تو پھر یاجوج وماجوج کہاں سے نکلیں گے؟

اس کا جواب ہمیں قرآن میں وارد ''السدین، فتحت اور حدب اور یَنسِلُونَ'' کے الفاظ سے مل جاتا ہے۔'' فتحت'' ''السد'' کا متقاضی ہے تو'' سد'' ''فتح'' کا۔

ب۔ منطقہ قطب شمالی وجنوبی کے لئے قرآن نے'' السدین'' کا لفظ استعمال کر کے اس بات کا اشارہ دے دیا تھا کہ ان دونوں جگہوں پر کچھ تو ایسا ہے جو کسی چیز کے لئے رکاوٹ بنا ہوا ہے، چنانچہ یہ دونوں جگہیں برف کی ہزاروں کلومیٹر لمبی چوڑی اور ہزاروں فٹ موٹی برف کی تہہ سے ڈھکی ہوئی ہیں ، یہی وہ برف کی چٹانیں ہیں جنھوں نے اپنے نیچے بڑے بڑے منفذ اور شگافوں کو ڈھانپ رکھا ہے،اسی بنا پرانہیں سدین سے تعبیر کیا گیا ہے۔

سورہ کہف کی آیت سے پتہ چلتا ہے کہ یاجوج و ماجوج صرف بین السدین والے علاقے سے ہی نہیں نکلا کرتے تھے بلکہ قطبین والے علاقوں سے بھی نکل سکتے تھے یا کبھی نکلا کرتے تھے جنہیں برف کی موٹی تہہ نے روک رکھا ہے۔اب سورہ انبیاء کی آیت نمبر ۹۶ میں موجود فُتِحَتْ، حَدَبٍ اور یَنسِلُونَ کے

الفاظ سے یہ بات مزید مؤکد ہوجاتی ہے کہ قرب قیامت اسی برفیلے علاقے کو چیر کر یاجوج وماجوج نکل پڑینگے۔

ت۔ قرآن نے ''السدین'' کے ذریعہ منطقہ قطب شمالی وجنوبی کو ہی تعبیر کیا ہے، اس کی وضاحت بالدلیل اپنے مقام پر ہوچکی ہے، یہاں قرآن کے لفظ ''حدب '' سے اس کی مزید تائید ہوجاتی ہے۔اس لئے کہ حدب کہتے ہیں ''کناروں سے ڈھلوان رکھنے والی ایسی چیز کو جو درمیان سے تقریباً ہموار ہو''۔اورزمین کے متعلق یہ بات ثابت شدہ حقیقت ہے کہ وہ قطبین سے محدب یعنی نسبتاً چپٹی ہے۔

ث۔منطقین ہی سدین ہیں اورقرب قیامت یہیں سے یاجوج وماجوج نکلیں گے اس بات پر''ینسلون'' کالفظ بھی دلالت کرتا ہے۔

مفسرین نے'' وھم من کل حدب ینسلون'' کا ترجمہ کیا ہے۔اوروہ ہر بلند جگہ سے تیزی سے چلے آئینگے۔

نسل ،ینسل ،نسلا ونسولا (ن،ض) کا معنی ہے''کسی چیز کا دوسری چیز سے تیزی کے ساتھ جدا ہونا یا کرنا''۔جیسے نسل ریش الطائر (پرندے کے پر جھڑنا) نسل الثوب عن الانسان (انسان کے کپڑے اتر جانا)۔نسل فلان (ض) کسی کی نسل بڑھنا۔نسل الحیوان (جانورکی نسل بڑھا کر فائدہ اٹھانا) نسل ریش الطائر۔ نسل صوف الحیوان۔ پرندے کے یاجانورکےاون جھاڑنا۔

جب نسل ینسل (ض) کے ساتھ من اورالیٰ جار مجرور کے صلات لاحق ہوں تو اس وقت اس کا معنی ہوگا کسی جگہ سے تیزی کے ساتھ نکل کر کسی ہدف کی

طرف دوڑنا۔ جیسے وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَإِذَا هُم مِّنَ الْأَجْدَاثِ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يَنسِلُونَ ﴿۵۱ یس﴾ اس آیت کی وضاحت سورہ معارج اور سورہ ق کی مذکورہ ہم معنی آیتوں سے بھی سمجھی جا سکتی ہے جن میں نفخ صور کے بعد انسانوں کے زمین سے نکلنے کا تذکرہ موجود ہے۔ يَوْمَ يَخْرُجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ سِرَاعًا كَأَنَّهُمْ إِلَىٰ نُصُبٍ يُوفِضُونَ ﴿۴۳ المعارج﴾ يَوْمَ تَشَقَّقُ الْأَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ۚ ذَٰلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيرٌ ﴿۴۴ ق﴾

اسی طرح یاجوج و ماجوج بھی قرب قیامت قطبین کی برف چیر کر تیزی سے نکل آئینگے اور قطبین کی چاروں طرف سے ایک دوسرے کی طرف بھاگے چلے آئینگے۔

اب یاجوج و ماجوج کے قطبین سے نکلنے پر کیا ہوگا؟

ماقبل کی وضاحت کے بعد یہ بات صاف ہوچکی ہے کہ جغرافیہ کی اصطلاح میں زمین کے جس رقبہ کو منطقہ باردہ جنوبی و شمالی کہا جاتا ہے، قرآن نے انہیں کو مغرب الشمس اور مطلع الشمس سے متعارف کروا کر اسی علاقے کو سدین اور حدبین سے بھی متصف کیا ہے۔

اب یاجوج و ماجوج کے لئے قطبین کی سد کھول دینے کا مطلب ہے کہ وہاں کی برف کے پگھلنے یا ان میں بڑے شگاف بن جانے سے وہ سوراخ کھل جائیں جن کو برف نے ڈھانک رکھا ہے۔

روئے زمین کی ۹۹ فی صد برف ان دونوں قطبین پر ہے، اگر قطبین کی

ساری برف پگھل جائے تو جانتے ہو کیا ہوگا؟

یہ برف اتنی زیادہ ہے کہ اگر یہ پگھل جاتی ہے تو سطح سمندر ۶۱ میٹر یعنی ۲۰۰ فٹ سے بھی زیادہ بلند ہو جائیگی ۔ اس کے نتیجہ میں ساحل سمندر بسے بے شمار شہر اور آبادیاں غرقاب ہو جائینگی، سطح سمندر بڑھنے کے ساتھ موسمی دورانیہ بھی بدل جائیگا، بارش بے ہنگم ہو جائیگی، آب و ہوا انسان کی بود و باش کے لائق نہیں رہیگی، انسانی آبادی میں کمی ہوتی چلی جائیگی، بے انتہا سردی پیدا ہو جائیگی۔

سائنسدانوں نے بڑھتی گلوبل وارمنگ کے پیش نظر کچھ سالوں قبل یہ اندازہ پیش کیا تھا کہ اگر اسی رفتار سے برف پگھلتی رہی تو مذکورہ بالا حالات پیدا ہونے کے لئے تقریباً ۵۰۰۰ سال کا عرصہ لگ جائیگا، لیکن حالیہ دنوں میں برف پگھلنے کی رفتار تین گنا بڑھ چکی ہے، ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا، آئندہ دنوں میں کس رفتار سے برف پگھلتی ہے اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کب کیا ہو جائے۔ یہ تو تب ہے جب برف کے خاتمہ کے لئے اوزون نامی پرت سے ہو کر آنے والی صرف سورج کی تیز روشنی کو ذمہدار مانا جائے لیکن اگر زیر زمین ہمیشہ متحرک اور نقب زنی میں کوشاں یاجوج و ماجوج کسی طرح اس جگہ پہنچ جاتے ہیں جہاں کی برف چیر کر وہ باہر آ سکتے ہیں تو پھر کیا ہوگا؟

یقیناً ایک وقت ایسا آنے والا ہے جب روئے زمین کی ساری برف پگھل کر انسان کے لئے تباہ کن منظر پیش کر دیگی، جسے قرآن نے **واذا البحار فجرت** ۔ اور دوسرے مقام پر **واذا البحار سجرت** سے تعبیر کیا ہے ۔ لیکن سورۂ انبیاء

میں وارد ''ینسلون'' کا لفظ بتلاتا ہے کہ مذکورہ بالا صورت حال پیش آنے سے پہلے ہی یاجوج و ماجوج کسی طرح قطبین کی برف کو توڑ پھوڑ کر نکلنے میں کامیاب ہوجائینگے

جب یاجوج و ماجوج نکل آئینگے تو اپنی طبیعی خصوصیت کی بنا پر (جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے) سمندروں کے پانی میں ہلچل برپا کرتے ہوئے سنامی جیسا ماحول پیدا کردینگے، ندی، نالوں، نہروں اور تلابوں کے پانی کو بھی اڑاتے پھرینگے۔ فعل وانفعال کے نتیجہ میں دور دراز اور اونچائی تک اوچھلنے والے پانی سے جو بادل اور آب وہوا تشکیل پائیگی اس میں یقیناً کھاراپن ہوگا۔ اب ذرہ اندازہ لگائیں کے انسان کا کیا حشر ہوگا! موسم بگڑ جائینگے، بارش نقصاندہ ثابت ہوگی، فصلیں تباہ ہوجائینگی، آب وہوا ناموافق ہوجائیگی، گرمی کی شدت بڑھ جائیگی اور روئے زمین کا ہرا بھرا اور خوشگوار نظام بگڑتا چلا جائیگا۔ الغرض موافق حیات حالات برقرار رکھنے والا نظام ربوبیت جسے ہم لائف سپورٹ سسٹم کہہ سکتے ہیں وہ درہم برہم ہوجائیگا۔ انسان بےبس ہوکر پکار اٹھیگا: یاویلنا قد کنا فی غفلة من هٰذا بل کنا ظالمین۔ ہماری خیرنہیں، ہم تو اس بات سے غفلت میں ہی پڑے رہے، نہیں بلکہ ہم ظالم ہی تھے۔ بےبس کردینے والے ان حالات کو دیکھ کر انسان کے سامنے اللہ کی خلاقیت وربوبیت حتمی طور پر عیاں ہوجائیگی، انسان جان لے گا کہ زمین کے نظام حیات کو برقرار رکھنے والے خالق کائنات کی ربوبیت و رحمت کے جن قوانین کو ہم اس سے پہلے سحر مستمر اور معمول کے واقعات میں

گردانتے ہوئے یہ کہتے چلے آئے تھے کہ ما یھلکنا الا الدھر وہ سب کا سب غلط تھا۔اب وہ ایمان تو لے آئینگے لیکن اب ان کے ایمان لانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

یاجوج وماجوج کا خروج کب ہوگا؟

اگر قرآنی فلسفہ کائنات پر غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دنیا کی صلاح اور نظم ونسق کے تسلسل کے ساتھ قائم رہنے کا مدار انسان کے اعمال ہیں، اگر انسان ایمان کے ساتھ نیک اعمال بجالاتا رہیگا تو دنیا اسی طرح خیر وصلاح کے ساتھ برقرار رہیگی لیکن جب کفر کے ساتھ بداعمالیاں اور ظلم واسراف غالب ہوتا جائے تو پھر دنیا تباہی اور مکمل فنا کی طرف اسی قدر تیزی سے بڑھتی چلی جائیگی۔

اس بات پر قرآن کی بہت ساری آیتیں شاہد ہیں۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ ﴿۴۱ الروم﴾

تَكَادُ السَّمَاوَاتُ يَتَفَطَّرْنَ مِن فَوْقِهِنَّ ۚ وَالْمَلَائِكَةُ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُونَ لِمَن فِي الْأَرْضِ ۗ أَلَا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴿۵ الشوری﴾

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ ﴿۷۱ المؤمنون﴾

ماقبل میں ہم دیکھ چکے کہ یاجوج وماجوج کا خروج دراصل معاملۂ رحمت کے اختتام کا اعلان ہوگا۔

بنیادی طور پر اللہ کی رحمت ہر چیز پر عام ہے، چاہے وہ جاندار ہو یا بے جان، حیوان ہو یا انسان، مؤمن ہو یا کافر۔رحیمی ورحمانیت پر مبنی ربوبیت کا یہ

کارخانہ تب تک رواں دواں ہے جب تک انسان کے لئے امتحان کی مہلت قائم ہے۔

آفاق وانفس کی نشانیوں، اقوام ماضی کے حالات اور انبیاء ورسل کی تعلیم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ ہر زمانے میں لوگوں کو اس بات کی طرف توجہ دلاتے رہے کہ یہ کارخانۂ جہاں کسی خالق ورب کے بغیر خود بخود ہی رواں دواں نہیں بلکہ اس کے پیچھے ایک زبردست علیم وخبیر ہستی کی کاریگری ومنصوبہ بندی کارفرما ہے۔

لیکن جو انسان انبیاء ورسل علیہم السلام کی تعلیم، التذکیر بآیات اللہ اور التذکیر بایام اللہ سے نصیحت لینے کی بجائے بدعملی میں تجاوز کرتا جاتا ہے، زمین میں فساد برپا کرتے ہوئے جب سرکشی پہ اتر آتا ہے تو اللہ کی رحمت کے دروازے ایسے شخص پر بند ہوجاتے ہیں، وہ لعنت کا مستحق ہوجاتا ہے۔ پھر اسے دوبارہ ایمان لے آنے کی توفیق نہیں ملتی۔ قرب قیامت جب انسانوں کی اکثریت ایسی صورت حال میں مبتلا ہوجائیگی تو پھر انسان اپنے کرتوت کے نتیجہ میں اللہ کی رحمت کے بجائے عذاب عام کا مستحق ہوجائیگا۔

جب انسان اللہ کی لعنت یا عذاب میں مبتلا کر دیا جائے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اس سے چھٹکارا نہیں دلاسکتی، چنانچہ جب دنیا میں کفر واسراف عام ہوجائیگا اور ایمان کی طرف رجوع ناممکن ہوجائیگا، جس کے بعد دنیا کو قائم رکھنے کا کوئی مقصد باقی نہیں رہتا، اس لئے کہ اب امتحان کس کا اور کس بات کا؟! چونکہ اب کفر ہی کفر اور ظلم ہی ظلم ہے، اب اللہ نے کافر کے دلوں پر انکے اسراف وطغیان کی وجہ

سے مہر لگا نے دی ہے اس لئے وہ اب کبھی ایمان نہیں لا ئینگے تو پھر ایسی صورت میں یاجوج و ماجوج کھول دئے جا ئینگے جن سے حفاظت کے لئے ردم بنا کر ذوالقرنین نے کہا تھا کہ یہ میرے رب کی رحمت ہے لیکن اب انسان رحمت کا مستحق نہیں رہا ،لہذا یاجوج و ماجوج کا عذاب انہیں ہر طرف سے گھیر لیگا۔

ذوالقرنین نے تعمیر ردم کے بعد کہا تھا: ھٰذا رحمۃ من ربی ۔ یہ میرے پروردگار کی طرف سے رحمت ہے ۔ یہاں رحمت کس کے لئے ہے اس بات کی تخصیص نہیں کی گئی بلکہ اسے بغیر اضافت کے عام رکھا ہے،جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ردم صرف اس قوم کی حفاظت کے لئے نہیں تھی بلکہ قیامت تک آنے والے دیگر انسانوں کی حفاظت کی غرض سے بھی تعمیر کی گئی تھی ، اگر یہ ردم اس وقت تعمیر نہ کی جاتی تو ہوسکتا تھا کہ یاجوج و ماجوج وہاں سے نکل کر ساری دنیا میں پھیل کر وہی تباہی مچاتے پھرتے جو قرب قیامت ہونی والی ہے۔لیکن یہ بات اللہ کو منظور نہیں تھی کیونکہ ابھی دنیا کے مختلف علاقوں میں اللہ کے نیک بندے کافی مقدار میں موجود تھے۔

یہاں کسی کو یہ سوال ہوسکتا ہے کہ خروج یاجوج و ماجوج جب اس قدر بڑی نشانی ہے کہ جس کے خروج کے بعد تمام کافر بے بس نظر آئینگے اور خالق کائنات پر ایمان لے آئینگے تو پھر بین السدین قوم اسے دیکھ کر کیوں ایمان نہیں لائی ؟

یاجوج و ماجوج کا یہ عذاب اس وقت ایسی تباہی کا منظر پیش کرنے والا نہیں تھا جیسی ہولنا کی قرب قیامت قطبین کی چاروں طرف سے نکل کر یاجوج و

ماجوج مچانے والے ہیں۔ بلکہ آیت وَمَا نُرِيهِم مِّنْ آيَةٍ إِلَّا هِيَ أَكْبَرُ مِنْ أُخْتِهَا وَأَخَذْنَاهُم بِالْعَذَابِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿٤٨ الزخرف﴾ اور وَلَنُذِيقَنَّهُم مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَى دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿٢١ السجدة﴾ ان آیتوں کے پیش نظر مقصد امتحان کو برقرار رکھتے ہوئے اس قوم کے لئے خروج یاجوج و ماجوج محض جزوی اثرات کا حامل اور چھوٹے پیمانے کا عذاب تھا کہ شاید وہ اسے دیکھ سمجھ کر ایمان لے آئے۔ لیکن اس کے باوجود بھی وہ قوم ایمان لا کر خالق کائنات کی قائل نہیں ہوئی۔

وہ کونسی نشانی ہے جس کے ظہور کے بعد ایمان یا نیک عمل قابل قبول نہیں ہوگا؟

هَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا أَن تَأْتِيهُمُ الْمَلَائِكَةُ أَوْ يَأْتِيَ رَبُّكَ أَوْ يَأْتِيَ بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ يَوْمَ يَأْتِي بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ لَا يَنفَعُ نَفْسًا إِيمَانُهَا لَمْ تَكُنْ آمَنَتْ مِن قَبْلُ أَوْ كَسَبَتْ فِي إِيمَانِهَا خَيْرًا قُلِ انتَظِرُوا إِنَّا مُنتَظِرُونَ ﴿١٥٨ الأنعام﴾

مذکورہ آیت میں یہ بات واضح طور پر بتلائی گئی ہے کہ جس دن کوئی (واضح) نشانی ظہور پذیر ہوجائیگی اس کے بعد کسی کافر کا ایمان لانا اور کسی مؤمن کا نیک عمل کرنا کوئی معنی نہیں رکھیگا۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کونسی نشانی ہے جس کے ظہور کے بعد ایمان اور نیک عمل قابل قبول نہیں ہوگا؟

قرآن نے اس اجمال کو مذکورہ ذیل آیت میں واضح کیا ہے۔

إِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ ﴿٩٢﴾ وَتَقَطَّعُوا أَمْرَهُم بَيْنَهُمْ ۖ كُلٌّ إِلَيْنَا رَاجِعُونَ ﴿٩٣﴾ فَمَن يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا

كُفْرَانَ لِسَعْيِهِ وَإِنَّا لَهُ كَاتِبُونَ ﴿٩٤﴾ وَحَرَامٌ عَلَى قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا أَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ﴿٩٥﴾ حَتَّى إِذَا فُتِحَتْ يَأْجُوجُ وَمَأْجُوجُ وَهُمْ مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَنْسِلُونَ ﴿٩٦﴾ وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَإِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ أَبْصَارُ الَّذِينَ كَفَرُوا يَاوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِي غَفْلَةٍ مِنْ هَذَا بَلْ كُنَّا ظَالِمِينَ ﴿٩٧﴾ الأنبياء

سورہ انبیاء کی ان آیات میں انبیاء علیہم السلام غیرہ کے مختلف احوال بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی کا مقصد اور انجام کار بتلاتے ہوئے فرمایا کہ

بلا شبہ تم سب ایک ہی امت تھے، (تمام لوگوں کے لئے ایک ہی حکم تھا کہ) میں تمہارا رب ہوں لہٰذا میری ہی پرستش کرنی ہے۔

(لیکن) لوگ مختلف گروہ میں بٹ گئے، (حالانکہ) سب کو میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے، (اور اپنے کئے کا حساب دینا ہے)

سو جو نیک اعمال بجالائیگا درآنحالیکہ وہ مؤمن بھی ہو تو اس کے عمل کو اکارت نہیں کیا جائیگا اور اس کے لئے ہم لکھتے جارہے ہیں، (لیکن نیک عمل کے بدلہ کا یہ وعدہ) ان لوگوں پر حرام ہے جن کو ہم نے ہلاک کردیا ہے بایں معنی کہ وہ لوگ ایمان لانے والے نہیں تھے۔

(یہ مہلت و امتحان کا موقع تب تک جاری ہے) یہاں تک کہ جب یاجوج اور ماجوج کھول دئے جائیں گے۔ حال یہ ہوگا کہ وہ زمین کے ہر (دو) محدب علاقوں سے تیزی سے نکل کر ایک دوسرے کی جانب دوڑے چلے آئینگے، اور (

اس طرح) سچے وعدے کا وقت قریب ہو چکا ہوگا۔ تو کافروں کی نگاہیں کھلی کی کھلی رہ جائینگی (کہنے لگیں گے) ہائے ہماری خیر نہیں، ہم تو اس بات سے غفلت میں ہی پڑے رہے، (غفلت میں نہیں) بلکہ ہم خطا کار ہی تھے۔

علماء مفسرین کے نزدیک سورہ انبیاء کی مذکورہ بالا آیات اور خاص کر '' وَحَرَامٌ عَلَى قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا أَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ﴿٩٥﴾ '' کے ترجمہ وتفسیر کو سمجھنے سمجھانے میں بہت زیادہ اختلاف واضطراب نظر آتا ہے۔

۱۔ اکثر مفسرین '' لا '' کو زائد گردانتے ہیں، چنانچہ '' حرام '' کو '' ناممکن '' کے معنی میں لیکر اور '' لا '' کو زائدہ مان کر آیت کا جو ترجمہ کیا ہے وہ کچھ اس طرح ہے: جو بستی اور اس کے لوگ ہم نے ہلاک کر دئے ہیں ان کے لئے محال ہے کہ وہ پھر لوٹ کر دنیا میں آجائیں۔

۲۔ جبکہ بعض حضرات نے حرام کو واجب کے معنی میں لیکر اور لا کو اپنے معروف معنی نفی کے لئے رکھتے ہوئے آیت کا جو مفہوم پیش کیا ہے وہ اس طرح ہے: اس بستی پر واجب ہے جسے ہم نے عذاب سے ہلاک کر دیا ہے کہ وہ دنیا میں نہیں لوٹینگے۔ (قرطبی)

۳۔ کسی کا کہنا ہے کہ یہاں عربی کے معروف اسلوب کے مطابق اھلکنٰھا کے بعد ایک جز حذف ہے، گویا عبارت ہے: و حرام علی قریۃ اھلکنٰھا ان یرجعوا أنھم لا یرجعون۔

ان تمام اقوال کے مطابق آیت کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ مرنے کے

بعد توبہ کا دروازہ بند ہوجاتا ہے، اگر کوئی دنیا میں آکر عمل صالح کرنا چاہے تو اس کا موقع نہیں ملیگا، اب تو صرف روز قیامت کی زندگی ہے۔

دوسرا یہ کہ کسی بستی کے لئے ایمان میں داخلہ حرام ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بد اعمالیاں، زیادتیاں اور حق سے پیہم روگردانیوں کی وجہ سے ان میں قبول ایمان کی استعداد ختم ہوجاتی ہے۔ پھر دوبارہ ایمان لے آنے کی توفیق نہیں ملتی۔

اللہ ان مفسرین کی کوششوں کا اجر دے کہ انہوں نے اپنی زندگیاں اس کام کے لئے کھپا دیں، لیکن آپ دیکھ سکتے ہیں کہ ان آیات کے مفاہیم بیان کرنے میں کس قدر تکلف سے کام لینا پڑ رہا ہے، حتیٰ کہ بنا کسی دلیل کے منفی کو مثبت اور حرام کو واجب یا ممتنع کے معنی میں لینے کی کوشش کی جارہی ہے۔

ان آیات کا اصل مفہوم کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے آخری امت کو متنبہ کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی فرمایا کہ

آج جو یہ تم لوگ کافر و مشرک، یہود و نصاری، مجوس و صابی جیسے گروہ میں بٹے ہوئے ہو، یہ سب ایک ہی امت تھے۔

سب کے لئے مختلف زمانوں میں انبیاء و رسل علیہ السلام کے ارسال اور تصریف آیات کے ذریعہ ایک ہی پیغام تھا کہ اللہ ہی ہر چیز کا خالق و رب ہے لہٰذا اسی عبادت کی جائے۔

اور یاد رکھا جائے کہ موت کے بعد اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے، جہاں اپنی اپنی

ذمہداری اور اچھے برے اعمال کا حساب دینا ہے۔

لیکن لوگ ہوا پرستی، عناد و نفرت، تکبر و غفلت جیسی وجوہات کی بنا پر اصل راہ سے ہٹ کر مختلف گروہ میں بٹتے چلے گئے۔

لیکن اے لوگو! گمراہی اور کفر کا راستہ اختیار کر لینے کے باوجود اب بھی تمہارے لئے موقع و مہلت برقرار ہے۔

چنانچہ جو لوگ دوبارہ ایمان لا کر نیک اعمال بجالائیں گے تو ان کے عمل کو اکارت نہیں ہونے دینگے بلکہ ہم اسے لکھتے جارہے ہیں اور یوم حساب جنت میں بہترین بدلا دیا جائیگا،

لیکن جو شخص رسول کی باتوں سے منہ پھیر کر کفر کرتے ہوئے سرکشی پر اتر آئے، اللہ کی نشانیوں اور رسولوں کا مذاق بھی اڑانے لگے تو ایسا شخص اپنے کئے کی وجہ سے اللہ کی لعنت کا شکار ہو جاتا ہے، ایسا آدمی کبھی ایمان کی طرف واپس نہیں آ سکتا، ایسا فرد چاہے کچھ اچھے اعمال بھی کرتا ہو لیکن اس کا کوئی اعتبار نہیں کیا جائیگا بلکہ جہنم ہی اس کا ٹھکانہ ہے۔

ہلاک شدہ لوگوں کے علاوہ دیگر لوگوں کے لئے ایمان و عمل کا یہ اختیار تب تک برقرار ہے جب تک یاجوج اور ماجوج نکل نہیں جاتے، جب یاجوج اور ماجوج کھول دئے جائینگے تو اس وقت ایمان لانے یا اچھے عمل کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ یاجوج و ماجوج کے خروج کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے حالات کو دیکھ کر ہر کافر پکار اٹھیگا کہ ہم غلطی پر تھے اور اس کائنات کا ایک خالق و پروردگار

ہے اور وہ اللہ ہے۔

ایمان وعمل کے اعتبار سے انسان مختلف اقسام کے ہیں

ایک شخص وہ ہے جو مؤمن ہونے کے ساتھ عمل صالح کا بھی پابند ہے

ایک وہ ہے جو مؤمن تو ہے لیکن بدعمل ہے

ایک شخص کافر تو ہے لیکن سرکش نہیں غفلت کی زندگی جی رہا ہے

ایک شخص کافر تو ہے لیکن ساتھ ہی کچھ اچھے اعمال بھی انجام دیتا رہتا ہے۔

لیکن ایک شخص ایسا ہے جو کفر سے تجاوز کر کے سرکشی اور استہزاء آیات ورسل کی حد کو پہنچ چکا ہے۔

مذکورہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے دو انتہاؤں کا تذکرہ کیا ہے کہ جو شخص مؤمن ہونے کے ساتھ نیک عمل بھی ہے تو اس کا ہر عمل لکھا جا رہا ہے اور اسے جنت کی صورت میں بہترین بدلہ دیا جائیگا ہے، لیکن جو کافر سرکشی اور استہزاء پر اتر آیا ہے وہ سیدھا جہنم میں جائیگا، اس کے نیک عمل کو لکھنے یا نہ لکھنے کا کوئی معنی نہیں۔

مذکورہ ذیل آیات پر غور فرمائیں:

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالاً (۱۰۳) الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا (۱۰۴) أُولَئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا (۱۰۵) ذَلِكَ جَزَاؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوا وَاتَّخَذُوا آيَاتِي وَرُسُلِي هُزُوًا (۱۰۶) إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنَّاتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلاً (۱۰۷) خَالِدِينَ فِيهَا لَا يَبْغُونَ عَنْهَا حِوَلاً (۱۰۸) (الکھف)

ان آیات کو دھیان میں رکھتے ہوئے سورۂ انبیاء کی آیات کو دوبارہ دوہرائیں!

فَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهِ وَإِنَّا لَهُ كَاتِبُونَ ﴿۹۴﴾ وَحَرَامٌ عَلَى قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا أَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ﴿۹۵﴾

جو بات سورہ کہف کی آیت نمبر ۱۰۴، ۱۰۵ اور ۱۰۶ میں بیان کی گئی ہے، وہی بات وَحَرَامٌ عَلَى قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا أَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ﴿۹۵﴾ میں بیان ہوئی ہے۔

یعنی جو لوگ ایمان لا کر نیک عمل کرتے ہیں ان کا ہر عمل لکھا جا رہا ہے اور روز قیامت ان اعمال کا وزن کر کے اسی کے مطابق جزا دی جائیگی لیکن جو کافر سرکشی وطغیان کو اپنی طبیعت میں شامل کر لیتے ہیں اور اللہ کی نشانیوں اور رسل علیہم السلام کا مذاق اڑاتے ہیں تو ایسے لوگوں کے اچھے اعمال بھی نہیں لکھے جائینگے اور روز قیامت ان کے اعمال کا کوئی وزن اور بدلہ نہیں دیا جائیگا۔

تنبیہ: قرآن کا یہ انداز بیان ایک تخویفی ہے، ورنہ انسان کا ہر عمل ریکارڈ کیا جا رہا ہے۔

وَحَرَامٌ عَلَى قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا أَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ﴿۹۵﴾ ترجمہ: اور یہ بات (یعنی نیک عمل کے بدلہ اور اس کو لکھنے کا یہ وعدہ) ان لوگوں پر حرام ہے جنہیں ہم ہلاک کر چکے ہیں کہ وہ لوٹ کے آنے والے نہیں ہیں۔

"حرام" ھذا مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ اب اصل عبارت ہوگی: وھٰذا (ای وعد الجزاء للعمل الصالح و کتابته) حَرَامٌ عَلَى قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا۔

اور "وأنھم" میں حرف تاکید "أن" وسط کلام میں واقع ہونے کی وجہ سے

مفتوح ہے۔ ''أنهم لا يرجعون'' دراصل تفسیر یا علت ہے ''أهلكنا'' کی۔

مذکورہ ذیل مثالوں پر غور فرمائیں۔

كَذَٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِينَ فَسَقُوا أَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿۳۳ یونس﴾

إِنِّي جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوا أَنَّهُمْ هُمُ الْفَائِزُونَ ﴿۱۱۱ المؤمنون﴾

أَلَمْ يَرَوْا كَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنَ الْقُرُونِ أَنَّهُمْ إِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُونَ ﴿۳۱ یس﴾

جس طرح ان مثالوں میں ''أَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ''۔ ''أَنَّهُمْ هُمُ الْفَائِزُونَ'' اور ''أَنَّهُمْ إِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُونَ'' بالترتیب ''حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ''۔ ''جَزَيْتُهُمْ'' اور ''أَهْلَكْنَا'' کی تفسیر یا علت ہے اسی طرح ''أَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُونَ'' ''أَهْلَكْنَا'' کی تفسیر و علت ہے۔

أَهْلَكْنَاهَا أَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُونَ: أهلك، يهلك، إهلاك کا معنی ہے موت دینا، چاہے وہ طبیعی موت ہو یا پھر قتل یا عذاب کی صورت میں۔

سنت اللہ کے مطابق جب کوئی رسول و نبی کے ذریعہ انذار و تبشیر، تصریف آیات اور اپنے گناہوں کی سزا دیکھ لینے کے باوجود ایمان کی طرف آنے کی بجائے کفر سے آگے سرکشی، طغیان اور استہزاء کی حد پار کرلیتا ہے تو اس کے بعد ایسے لوگوں کو اللہ کی لعنت گھیر لیتی ہے، ایسے لوگوں کو دوبارہ ایمان لے آنے کی توفیق نہیں ملتی۔ اب ان کے کسی اچھے عمل کو لکھنے کا بھی کوئی معنی نہیں، چونکہ روز حساب ان کی نیک عملی کا کوئی وزن نہیں ہوگا، بلکہ ان کے لئے سیدھے جہنم جانے کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے، اب ایسے لوگوں کا دنیا میں رہنا یا نہ رہنا کوئی معنی نہیں

رکھتا، چنانچہ یا تو انہیں عذاب کے ذریعہ ہلاک کر دیا جاتا ہے یا پھر طبیعی موت تک چھوڑ دیا جاتا ہے۔ جس طرح عذاب سے مار دئے گئے لوگ دوبارہ زندہ ہوکر ایمان نہیں لاسکتے اسی طرح مؤخر الذکر کے زندہ رہ جانے کا بھی کوئی مطلب نہیں کیونکہ وہ بھی دوبارہ کبھی ایمان نہیں لائینگے۔ یعنی اعمال شنیعہ کی نحوست کے نتیجہ میں دونوں کے لئے عدم رجوع کا ایک ہی جیسا فیصلہ ہو چکا ہے، اس لئے اللہ نے ان دونوں کے لئے ''اھلکنا'' فعل ماضی کا صیغہ استعمال فرمایا ہے۔

ایمان وعمل کی مہلت کب تک؟

حَتَّىٰ إِذَا فُتِحَتْ يَأْجُوجُ وَمَأْجُوجُ وَهُم مِّن كُلِّ حَدَبٍ يَنسِلُونَ ﴿٩٦﴾ وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَإِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ أَبْصَارُ الَّذِينَ كَفَرُوا يَا وَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هَٰذَا بَلْ كُنَّا ظَالِمِينَ ﴿٩٧﴾

حتیٰ انتہا کو بتلاتا ہے، جس کا ایک معنی یہ ہوگا کہ (ہلاک شدہ قوم کے علاوہ) دیگر مؤمن و کافر دونوں کے لئے ایمان و عمل کا اختیار اور اس پر جزا کا وعدہ تب تک برقرار ہے جب تک یاجوج اور ماجوج کھول نہیں دئے جاتے۔

اس کا دوسرا معنی یہ بھی ہے کہ ہلاک شدہ قوم جن کے دوبارہ ایمان لے آنے کی کوئی توقع نہیں وہ جو جی میں آئے کرتے پھریں، حتی کہ جب یاجوج و ماجوج نکل آئینگے تو ان کی وجہ سے ہونے والی تباہ کاری کو دیکھ کر کافر بول اٹھینگے کہ اب ہمارا کیا ہوگا! ہم نے اللہ کا انکار کر کے ظلم ہی کیا ہے۔ یعنی جو لوگ آفاق و انفس کی نشانیوں کو دیکھ کر اللہ کی ربوبیت، خالقیت اور رحم و کرم والے معاملے کو سمجھ کر

ایمان لے آنے کی بجائے ان نشانیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے انہیں سحر مستمر سمجھ رہے تھے، خالق کائنات کے نظام ربوبیت اور تکوینی امور کو فطرت کے اندھے بہرے قوانین کی کارفرمائی کا نام دیکر اللہ کا انکار کرتے رہے تھے وہ یاجوج و ماجوج کی ہولناکی والی نشانی کو دیکھ کر اللہ کی ربوبیت، خالقیت اور رحمانیت پر ایمان لے آئینگے، لیکن اس وقت وہ قابل قبول نہیں ہوگا۔

جو لوگ کفر کی ایسی حد کو پہنچ جاتے ہیں، انہیں قرآن نے بار بار صم، بکم، عمی کہہ کر بتلایا ہے کہ انہیں نصیحت اور انذار و تبشیر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں چونکہ وہ لوگ اب ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ۔

لیکن رحمت و مہلت کا یہ موقع اللہ تعالیٰ محض کفر کرنے پر نہیں چھین لیتا بلکہ اس کے لئے بہت ساری شرائط ہیں، جنہیں مذکورہ ذیل آیات میں دیکھا جاسکتا ہے

وَمَا أَهْلَكْنَا مِن قَرْيَةٍ إِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُومٌ ﴿۴ الحجر﴾

وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرَىٰ حَتَّىٰ يَبْعَثَ فِي أُمِّهَا رَسُولًا ﴿۵۹ القصص﴾

وَمَا أَهْلَكْنَا مِن قَرْيَةٍ إِلَّا لَهَا مُنذِرُونَ ﴿۲۰۸ الشعراء﴾

ذَٰلِكَ أَن لَّمْ يَكُن رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرَىٰ بِظُلْمٍ وَأَهْلُهَا غَافِلُونَ ﴿۱۳۱ الأنعام﴾

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرَىٰ بِظُلْمٍ وَأَهْلُهَا مُصْلِحُونَ ﴿۱۱۷ هود﴾

وَلَنُذِيقَنَّهُم مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿۲۱ السجدة﴾

وَإِذَا أَرَدْنَا أَن نُّهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا ﴿۱۶ الإسراء﴾

وَتِلْكَ الْقُرَىٰ أَهْلَكْنَاهُمْ لَمَّا ظَلَمُوا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِم مَّوْعِدًا ﴿۵۹

الکھف﴾

وَكَأَيِّن مِّن قَرْيَةٍ أَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ﴿۴۸ الحج﴾

وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرَىٰ إِلَّا وَأَهْلُهَا ظَالِمُونَ ﴿۵۹ القصص﴾

الغرض سورۂ انبیاء آیت نمبر ۹۶ اور ۹۷ کے ذریعہ بظاہر وہ اجمال دور ہوجاتا ہے جو سورہ انعام کی آیت نمبر ۱۵۸ میں تھا کہ وہ کونسی نشانی ہے جس کے ظہور کے بعد ایمان وعمل کی جزا کا وعدہ ختم ہوجاتا ہے۔ پھر بھی ان شاء اللہ مزید مدلل بحث پھر کبھی۔

ذوالقرنین کون تھے؟

قرآن پر اعتراض کرنے والے دور جدید کے معترضین نے قصۂ ذو القرنین میں مذکور کئی باتوں کو اپنے معاندانہ استہزاء کا نشانہ بنا رکھا تھا۔لیکن ماقبل میں ذوالقرنین کی عظمت کے بارے میں وضاحت کردہ زندہ ثبوتوں کے بعد اب ان معترضین اور ان کے پیروکاروں کے پاس قرآن کی حقانیت اور اسلام کو مان لینے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذوالقرنین کے متعلق سوال کا گیا تو قرآن نے جواب دیا: إِنَّا مَكَّنَّا لَهُ فِي الْأَرْضِ وَآتَيْنَاهُ مِن كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ﴿۸۴﴾

ہم نے ذوالقرنین کو زمین (کے تکوینی امور) میں تصرفات کی قدرت دے رکھی تھی اور اسے ہر قسم کی سواری عطا کی تھی۔

مترجمین نے آیت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے: کہ اللہ تعالیٰ نے

ذوالقرنین کوعظیم الشان سلطنت عطا کی تھی اور اس کو چلانے کے لئے ہر قسم کے اسباب ووسائل سے نوازا تھا۔ چنانچہ مؤرخین اسلام ومفسرین میں سے کوئی اسکندر کو ذوالقرنین بتلا رہا ہے، کوئی فارس اور میڈیا کی متحدہ سلطنت قائم کر کے عرب سے لیکر بحر اسود تک اور ایشیاء کوچک سے لیکر بلخ تک ایشیا کی تمام قوموں کو اپنے ماتحت بنا کر ۵۳۹ قبل مسیح میں انتقال کر جانے والے سائرس کو ذوالقرنین ثابت کرنے کے لئے پورا زور لگا تا نظر آتا ہے تو کوئی کہتا ہے کہ ذوالقرنین دراصل سلیمان علیہ السلام کا ہی لقب تھا۔ کوئی کہتا ہے کہ ذوالقرنین نبی تھے تو کوئی ثابت کرتا ہے کہ وہ ایک عادل اور مشرق ومغرب کے ممالک پر حکومت قائم کرنے والا ایک بادشاہ تھا، وغیرہ وغیرہ

قصۂ ذوالقرنین کی ابتدا کرتے وقت اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی فرمایا تھا: وَيَسْأَلُونَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ ۖ قُلْ سَأَتْلُو عَلَيْكُمْ مِنْهُ ذِكْرًا ﴿۸۳﴾ وہ آپ سے ذوالقرنین کے متعلق پوچھتے ہیں، کہہ دو کہ میں تمہیں اس کا کچھ نصیحت آموز حال کہہ سناتا ہوں۔

یعنی ذوالقرنین کے متعلق جو بات کہی جائیگی وہ ایسی مدلل ہوگی کہ قیامت تک آنے والے انسانوں کے لئے نصیحت کا سامان بن سکے، چنانچہ مابعد آیت میں ذوالقرنین کے متعلق دعوی کرتے ہوئے فرمایا: إِنَّا مَكَّنَّا لَهُ فِي الْأَرْضِ وَآتَيْنَاهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ﴿۸۴ الکھف﴾ ترجمہ: ہم نے ذوالقرنین کو زمینی معاملات میں تصرفات کی قدرت دے رکھی تھی اور اسے ہر قسم کی سواری عطا کی تھی

مکن لہ فی شیئٍ: کسی کوکسی معاملہ میں اختیار وقدرت عطا کرنا۔ یہ تعبیر قرآن میں مختلف مقامات میں وارد ہوئی ہیں، جن کا حقیقی مصداق سیاق و سباق سے طے کیا جاتا ہے کہ قدرت واختیار کا دائرہ کار کیا ہے۔

زیر بحث آیت میں زمین کے تکوینی معاملات مراد لینے کی وجہ مابعد آنے والا جملہ وَآتَيْنَاهُ مِن كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ہے۔

زمینی معاملات چاہے حکمرانی کے قبیل سے ہوں یا تکوینی امور سے ہر ایک میں بقدر ضرورت تصرفات کی قدرت عطا کی گئی تھی۔ چنانچہ ہم نے اگلے صفحات میں دیکھ لیا کہ ذوالقرنین کو اللہ نے کس قسم کی قدرت واختیار سے نوازا تھا۔

سَبَبًا : سبب کی جمع اسباب ہے۔رسی، راستہ، وسیلہ وذریعہ اور اسی طرح ہر اس چیز کو ''سبب'' کہا جاتا ہے جس سے دوسری چیز کی طرف پہنچا جائے۔

والسبب: الحبل. قالوا للسبب: طريق و ذريعة.

السبب: الحبل الذی یصعد به النخل، وہ رسی جس سے کھجور کے درخت پر چڑھا جائے۔

وسمی کل مایتوسل به إلی شیء سببا۔

قرآن میں ۹ مقامات پر یہ لفظ آیا ہے جن میں چار بار زیر بحث سورۃ میں ہی وارد ہے۔

وَآتَيْنَاهُ مِن كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ﴿۸۴ الکهف﴾

فَأَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۸۵ الکهف﴾

ثُمَّ أَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۸۹﴾ الکھف

ثُمَّ أَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۹۲﴾ الکھف

فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ إِلَى السَّمَاءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهُ مَا يَغِيظُ ﴿۱۵﴾ الحج

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يَا هَامَانُ ابْنِ لِي صَرْحًا لَعَلِّي أَبْلُغُ الْأَسْبَابَ ﴿۳۶﴾ أَسْبَابَ السَّمَاوَاتِ فَأَطَّلِعَ إِلَى إِلَٰهِ مُوسَىٰ وَإِنِّي لَأَظُنُّهُ كَاذِبًا ۳۷ ﴿غافر﴾

أَمْ لَهُم مُّلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۖ فَلْيَرْتَقُوا فِي الْأَسْبَابِ ﴿۱۰﴾ جُندٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُومٌ مِّنَ الْأَحْزَابِ ﴿۱۱﴾ ﴿ص﴾

سورہ الحج، ص اور غافر میں مذکور سبب اور اسباب پر غور فرمائیں! ہر ایک کا تعلق بلندی اور آسمان سے ہے۔ کیا بلندی اور آسمان میں بغیر خلائی سواری کے جانا انسان کے لئے ممکن ہے!؟

ذرہ سورہ ''ص'' کی مذکورہ آیت کے ساتھ سورہ رحمٰن کی ان آیتوں کو ملا کر دیکھیں۔

يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالإِنسِ إِنِ اسْتَطَعْتُمْ أَن تَنفُذُوا مِنْ أَقْطَارِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ فَانفُذُوا لا تَنفُذُونَ إِلاَّ بِسُلْطَانٍ (۳۳) فَبِأَيِّ آلاء رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ (۳۴) يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّن نَّارٍ وَنُحَاسٌ فَلا تَنتَصِرَانِ (۳۵) ﴿الرحمن﴾

ان دونوں سورتوں میں السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا اور أَقْطَارِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ سے مراد ''نظام شمسی'' ہے۔ جن و انس سرکشی کرتے ہوئے ایک دن اسے فلانگنے کی کوشش کرینگے؛ لیکن جہاں بھی جائینگے وہاں اللہ کی قدرت

و بادشاہی کا ہی انہیں سامنا ہوگا۔

یقیناً ہمارے قاری السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا سے مراد ''نظام شمسی'' لئے جانے پر پس و پیش میں ہونگے۔ان شاء اللہ کبھی اس پر مدلل بحث ہوگی ، پھر بھی سر دست ایک بات بتلاتا چلوں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بار بار ارض و سمٰوٰت میں غور فکر کرنے کی دعوت دی ہے۔اب کیا جو چیز نا قابل مشاہدہ اور انسان کی دسترس سے باہر ہو اس میں غور فکر کی دعوت دی جاسکتی ہے؟

أَوَلَمْ يَنظُرُوا فِي مَلَكُوتِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللَّهُ مِن شَيْءٍ وَأَنْ عَسَىٰ أَن يَكُونَ قَدِ اقْتَرَبَ أَجَلُهُمْ ۖ فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَهُ يُؤْمِنُونَ ﴿١٨٥﴾ الأعراف

اب ذرہ قصۂ ابراہیم علیہ السلام کو دوہرائیں۔

وَكَذَٰلِكَ نُرِي إِبْرَاهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلِيَكُونَ مِنَ الْمُوقِنِينَ ﴿٧٥﴾ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَأَىٰ كَوْكَبًا ۖ قَالَ هَٰذَا رَبِّي ۖ فَلَمَّا أَفَلَ قَالَ لَا أُحِبُّ الْآفِلِينَ ﴿٧٦﴾ فَلَمَّا رَأَى الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هَٰذَا رَبِّي ۖ فَلَمَّا أَفَلَ قَالَ لَئِن لَّمْ يَهْدِنِي رَبِّي لَأَكُونَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّالِّينَ ﴿٧٧﴾ فَلَمَّا رَأَى الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هَٰذَا رَبِّي هَٰذَا أَكْبَرُ ۖ فَلَمَّا أَفَلَتْ قَالَ يَا قَوْمِ إِنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ ﴿٧٨﴾ إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا ۖ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿٧٩﴾ ﴿الأنعام﴾

فَلَمَّا سے آگے نُرِي إِبْرَاهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ کی تفسیر ہے، اس میں کوکب، قمر اور شمس کو ہی مَلَكُوتَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ کہا گیا ہے، یہی

وجہ ہے کہ ان کے مشاہدہ کے بعد ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا ۖ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۔

الحاصل سبب کا معنی خلائی سواری بھی ہے۔

وَآتَيْنَاهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ۔ ''سبباً'' ''مِنْ كُلِّ شَيْءٍ'' کی تمیز ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ یعنی ہم نے اسے حمل ونقل کے لئے ہر قسم کی سواری عطا کی تھی۔ یعنی بری، بحری اور خلائی یا ہوائی۔

اگر سبب کے اصلی معنی کو مدنظر رکھتے ہوئے دیکھا جائے تو یہ سواریاں نسبتاً لمبی ہونی چاہیے۔ اس لئے کہ سبب کے معانی میں رسی، دھاگہ، عمامہ، دوپٹہ، راستہ جیسی دیگر تمام چیزیں لمبی ہیں۔

أَتْبَعَتِ الماشيةُ ونحوُها: صارت ذاتَ تَبِيعٍ، فهي مُتبِعٌ، ومُتبِعة.

أَتْبَعَ کا معنی بتلاتا ہے کہ یہ سواریاں خودکار قسم کی ہونی چاہیے۔

أتبَع باب افعال سے ہے۔ پیچھے ہونا، پیچھے سے جاملنا، تعاقب کرنا۔ اتّباع باب افتعال اور اتباع باب افعال میں فرق یہ ہے کہ پہلے کے فعل کا تعلق معنویات ہے جیسے اتَّبَعَ القرآنَ والحديث: اى عمِل بما فيهما. جبکہ دوسرے کا تعلق حسیات سے ہے۔ جیسے فَأَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُودُهُ۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم آگے آگے بھاگی جارہی تھی اور فرعون اور اس کا لشکر ان کے پیچھے پیچھے تعاقب کرتے ہوئے آرہے تھے۔

اتباع کے معنی میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ مُتْبِع یعنی پیچھے چلنے

والے یا پیچھا کرنے والے کی دوڑ مُتبَع کے تابع ہوتی ہے۔ مُتبَع جدھر جاتا ہے ، اسی طرف مُتبِع کو بھی جانا پڑتا ہے۔ دوسری طرف مُتبَع کے بھاگنے کی وجہ مُتبِع ہے۔

اب فَأَتْبَعَ سَبَبًا کا معنی سمجھ میں آ چکا ہوگا کہ سَبَبًا مُتبَع ہے اور سوار مُتبِع ۔سبب یعنی سواری جدھر لے جا رہی ہے سوار اسی طرف جا رہا ہے، اسی کو خود کار کہتے ہیں۔

ماضی کے صفحات میں بیان کردہ ذوالقرنین کے کارناموں اور اسفار کے تذکرہ کے بعد اب اس بات کو مزید دوہرانے کی کوئی ضرورت نہیں رہتی کہ ذو القرنین کون تھے؟

ذوالقرنین یعنی بحری ، بری اور فضائی سواریوں کے ذریعہ دنیا بھر کے تکوینی مسائل کو حل کرنے والا تاریخ انسانی کا واحد ایسا شخص جو جغرافیہ، طبیعیات اور کیمسٹری کا بادشاہ تھا۔

سوچو کہ قرآن نے اس کی زندگی کا محض ایک چھوٹا سا گوشہ ذکر کیا ہے، اگر ان کے تمام کارناموں کو بیان کیا جائے تو کیا ہوگا!

ٹکنالوجی اور جدید سواریاں لازم ملزوم

یہاں ایک سوال ہے کہ آیت میں ذوالقرنین کے متعلق دو دعوے کئے گئے ہیں، ایک یہ کہ اسے زمینی تصرفات کا مالک بنایا تھا، دوسرا یہ کہ اسے ہر قسم کی سواری سے نوازا تھا۔ان دو دعووں میں بظاہر کیا ربط ہے؟

ماقبل کے صفحات سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ ذوالقرنین سائنس و ٹکنالوجی کا بادشاہ تھا، ایسی ٹکنالوجی کا ماہر جو موجودہ دور سے کہیں زیادہ ایڈوانس تھی ۔اب سمجھیے کہ کوئی بھی سائنس وٹکنالوجی تب تک کامیاب نہیں کہلائی جاسکتی جب تک وسائل نقل وحمل کے لئے اسی معیار کی سواریاں موجود نہ ہوں ۔ ذرہ موجودہ دور کی سائنسی ترقی میں سے ہوائی جہاز، آبی جہاز، ٹرین اور گاڑیوں کو نکال دیکھیں ،ساری کی ساری سائنس وترقی وہیں کی وہیں ڈھیر ہوجائیگی ۔ ظاہر سی بات ہے جب ذوالقرنین کو ساری زمین میں بقدر ضرورت تکوینی تصرفات کا اختیار حاصل تھا تو انہیں اسی طرح کی معیاری سواریاں بھی دی گئی ہونگی ، چنانچہ پہلے مقام پر جس سواری کا استعمال ہوا وہ نہایت اعلی قسم کا بحری جہاز تھا، دوسرے مقام کے لئے جو سواری استعمال کی گئی وہ کوئی زمینی سواری ہوگی لیکن جو سواری تیسرے مقام کے لئے استعمال کی گئی وہ ایسا طیارہ تھا جس کا تصور موجودہ سائنس کے پاس اب تک موجود نہیں ۔

سوچیے ! برفیلی چٹانوں اور ٹھاٹھیں مارتے خطرناک ترین پانی سے بھرے چشمۂ واشگاف میں، جہاں دور جدید کی سائنسی ترقی کے باوجود سوچ سمجھ کر پلاننگ کے ساتھ جانا پڑتا ہے، کیا اس میں کسی ایسی بادبانی کشتی کے ذریعہ سفر ممکن ہے جسے ہزاروں سال پہلے لوگ استعمال کیا کرتے تھے؟!

ذرہ سوچیے ! برمیوڈا ٹرائنگل یعنی ردم ذوالقرنین کا علاقہ جہاں بحری جہاز تو کیا فائٹر پلین تک پرواز نہیں بھر سکتا اس پر کس قسم کے ہائی ٹکنالوجی والے

جہاز سے کام لیکر اس کے آخری مرحلہ کی تعمیر کی گئی ہوگی جس کے فوراً بعد ایسی ردم تیار ہوگئی جہاں سے کوئی پرواز نہیں کرسکتا؟!

اس طرح یہ بات بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ ذوالقرنین کو ذوالقرنین کیوں کہا جاتا ہے، قرن کا معنی ہے مخصوص تہذیب وثقافت پر مبنی ایک زمانہ، ذوالقرنین جس قرن میں جیتے تھے اس میں ان کے پاس وہ علم اور ٹکنالوجی تھی جو دوسرے زمانہ سے متعلق تھی، گویا وہ دوزمانوں والے کہلائے۔

سائنسی دور

آخر میں ایک سوال کو حل کرتے چلیں کہ کیا سائنس وٹکنالوجی دورجدید کی ایجاد ہے یا پھر ماضی میں کوئی ایسا دور بھی گذرا ہے جس میں اس قسم کی سائنسی ترقی ہوچکی ہو؟

اس سوال کو حل کرنے کے لئے ہمارے پاس تین بنیادیں ہیں۔قرآن، تاریخ اور عقلی تقاضہ

قرآن کی بات کرنے سے پہلے ہم تاریخی باتوں کو دیکھ لیتے ہیں۔ ہمارے سامنے ماضی سے وابستہ کئی پراسرار چیزیں ایسی ہیں جن کو تب تک سلجھایا نہیں جا سکتا جب تک ہم یہ باور نہ کرلیں کہ ماضی میں بھی لوگ کبھی ہوائی جہاز اور ترقی یافتہ سائنس سے کام لیا کرتے تھے، یا پھر یہ مان لیں کہ زمین کے علاوہ کہیں اور سے آکر کسی مخلوق نے یہ کام انجام دئے ہیں۔

۱۔پیرو میں موجود نزکا لائنس (the Nazca lines , peru)

سطح زمین پر بنی کئی کئی کلو میٹر لمبی اور صرف خلا سے نظر آنے والی مختلف قسم کی شکلیں سائنسدانوں کے لئے ایک معمہ بنی ہوئی ہیں ۔ان میں بعض شکلیں بندر، مکڑی اور پرندے جیسی ہیں تو بعض دیگر قسم کی ۔ یہ شکلیں کب کس نے بنائی اور ان کے بنانے کا مقصد کیا تھا؟ یہ اب تک کسی کو نہیں معلوم ۔ البتہ ان کی ہیئت کو دیکھتے ہوئے اتنی بات یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ فضائی یا خلائی مسافر کے علاوہ اہل زمین کے لئے اسکا کوئی مقصد نظر نہیں آتا کیونکہ سطح زمین پر رہتے ہوئے اس کا خاکہ تک نظر نہیں آتا، تو پھر بغیر ہوائی معائنہ کے ایسی شکلیں بنا لینا نا قابل یقین ہے ۔ کیا ان کا مقصد کسی ہوائی مخلوق کو اہل زمین کی طرف سے کوئی اشارہ دینا تھا یا کسی بیرونی مخلوق نے اپنی آمدورفت کی نشانی کے طور پر انہیں بنایا تھا۔ یا پھر ماضی کا انسان بھی ہوائی جہاز جیسی سواریاں استعمال کیا کرتا تھا۔



۲۔ کوسٹاریکا (Costa Rica) میں ۱۹۳۰ کے دوران ملے ۱۶ ٹن تک وزنی تقریباً ۳۰۰ پتھر کے بڑے بڑے گولے بھی ایک معمہ بنے ہوئے ہیں جنہیں (Las Balos) بھی کہا جاتا ہے، ان کی تراش وخراش کو دیکھ کر کوئی بھی

اندازہ لگا سکتا ہے کہ انہیں انسانوں نے ہی کسی زمانہ میں اس ڈھنگ سے تراشا ہے ،لیکن آج تک ان کے متعلق یہ پتہ نہیں چل پایا کہ انہیں کس نے اور آخر کس مقصد سے بنایا تھا۔



۳۔ وسطیٰ لاوس (Xiengkhouang province of central Laos) میں ٹنوں وزنی، دس فٹ تک لمبے دو ہزار سے زائد بکھرے پڑے جار بھی آج تک ایک راز بنے ہوئے ہیں۔ کسی کو نہیں معلوم کہ انہیں کس



مقصد کے لئے کس نے بنایا تھا؟

۴۔شمالی آئر لینڈ میں واقع (The Giant's Causeway)

پانچ لاکھ چالیس ہزار بیسالٹ چٹانوں سے بنا کوزوے بھی پر اسرار مقامات میں شامل ہے، کہ اتنا بڑا کوزوے آخر کس نے اور کیوں بنایا ہے۔ ۱۹۸۶ میں یونیسکو نے اسے عالمی وراثت کی حیثیت دی ہے۔



۵۔چلی (Easter Island) کے بت، بحر الکاہل میں ایسٹر آئی لینڈ نامی جزیرہ ہے، یہاں قدیم انسانی آبادی کے کوئی ثبوت نہیں لیکن اس کے باوجود یہاں پر سخت قسم کے پتھر سے بنائے گئے تقریباً ۸۸۷ بڑے بڑے مجسمے موجود ہیں، جو ۳۰ سے ۴۰ فٹ لمبے اور تقریباً ۱۰۰ ٹن وزنی ہیں۔ ان سب کی پشت سمندروں کی جانب ہے، ان میں صرف ایک مجسمہ ایسا ہے جو گھٹنے کے بل بیٹھا نظر آتا ہے۔ آخر ایسی ویران جگہ پر اس قدر دیوہیکل مجسمے اس دور کے انسان نے کیسے تراش کھڑے کئے اور ان کے بنانے کا مقصد کیا تھا؟ آج تک اس راز کو کوئی

حل نہیں کر پایا۔



ان کے علاوہ دیگر بے شمار انسانی باقیات ایسے ہیں جنکا معمہ اب تک کسی

سے حل نہیں ہو پایا ہے۔

لیکن تاریخی طور پر پائی جانے والی ان تمام انسانی کاوشوں میں سب سے

زیادہ حیرت انگیز اور دنیا کے سات عجائبات میں جسے سب سے اول مقام دیا گیا

ہے وہ ہے ''اہرام مصر''۔ تقریباً چار ہزار سال پہلے فرعون کے ذریعہ بنائے گئے

اہرام مصر کے معمہ کو حل کرنے کے لئے دنیا بھر کے سائنس داں اور آرکیالوجسٹ

دور جدید کی نت نئی ٹکنالوجی کے ذریعہ سالوں کی محنت کے بعد بھی اس راز سے پردہ

نہیں اٹھا پائے کہ آخر اتنی عظیم الشان تعمیر انسانوں کے ذریعہ کیسے ممکن ہوئی ہوگی!

اتنی بڑی تعمیر کا مقصد کیا تھا اور انہیں کیسے بنایا گیا ہوگا۔

دنیا بھر میں یوں تو بے شمار پیرامڈس پائے جاتے ہیں، مصر میں بھی تقریبا

۱۳۸ اہرام موجود ہیں، لیکن ان اہرام مصر میں سب سے یکتا وہ تین اہرام ''خوفو،

خافرا اور مینکاور“ ہیں جو مصر کی دارالحکومت قاہرہ سے باہر غزہ میں موجود ہیں، انہیں دنیا کے سات عجائبات میں شمار کیا جاتا ہے۔

سب سے بڑا اہرم خوفو کا مقبرہ ۱۳ ۱۱ ایکڑ زمین کے رقبہ پر پھیلا ہوا ہے، ان



اہرام کی تعمیر کا زمانہ چار سے پانچ ہزار سال پہلے کا بتلایا جاتا ہے، ان اہرام میں جو سب سے بلند ہے، اس کی اونچائی ۴۸۱ فٹ تھی جواب ۴۵۵ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان اہرام کو بنانے میں تقریباً ۳۰ لاکھ مزدوروں نے ۲۳ سال تک کام کیا ہوگا۔ ان اہرام کو بنانے کے لئے چونے کے ۲۳ لاکھ پتھر استعمال کئے گئے ہیں، جن میں ہر ایک پتھر کا وزن ۲ سے ۳۰ اور ۵۰ ٹن تک کا ہے۔ ان میں سب سے بڑے اہرام کا مجموعی وزن تقریباً ستاون لاکھ پچاس ہزار ٹن ہے جبکہ موجودہ دور کی سب سے بلند عمارت برج الخلیفہ کا وزن صرف پانچ لاکھ ٹن ہے۔

آخر فنی مہارت کا اتنا شاندار نمونہ بنانے کا مقصد کیا تھا؟ کہا جاتا ہے کہ انہیں فوخو بادشاہ نے چار ہزار سال پہلے اپنے مقبرے کے طور پر بنوا تھا۔ ابتدا میں

بہت سے لوگوں کا ماننا تھا کہ ان اہرام کو مقبرے کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا جن میں بادشاہوں کی حنوط شدہ لاشوں کو ممی بنا کر رکھ دیا جاتا تھا۔ کسی کا کہنا ہے کہ ان اہرام کے بنانے کا مقصد بطور مقبرہ استعمال کرنا نہیں بلکہ کچھ اور ہونا چاہیے کیونکہ آج تک کسی بھی اہرام میں کوئی ممی یعنی حنوط شدہ لاش نہیں ملی (ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ ان حنوط شدہ لاشوں کو کسی نے چرا لیا ہو)۔ کچھ دلائل کی بنیاد پر ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ یہ ایک پاور پلانٹ تھا، جس سے بجلی بنائی جاتی تھی۔ کسی کا کہنا ہے کہ حوادث زمانہ سے اپنے ایجاد کردہ علوم وفنون کو بچانے کے لئے یہ اہرام تعمیر کئے گئے، یا پھر علم نجوم کی رصدگاہ بھی ہوسکتی ہے، کوئی کہتا ہے کہ یہ اہرام زلزلوں کو روکنے کا کام کرتے ہیں۔ کسی کا کہنا ہے کہ یہ اہرام کسی خلائی مخلوق نے بنائے ہیں، کسی کا کہنا ہے کہ گزشتہ دور کی ترقی یافتہ قومیں کرسٹل انرجی یا شمسی توانائی یا پھر کاسمک ریز کے حصول کے لئے ان اہرام کو بطور پاور پلانٹ استعمال کرتی تھیں۔ کچھ سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ ان اہرام کو ایک جگہ کی توانائی کو دوسری جگہ یا دوسری جگہ کی توانائی کو موصول کرنے کے لئے بطور انٹینا استعمال کیا جاتا تھا۔

الغرض ان اہرام کو کس نے، کب اور کس مقصد کے لئے بنایا؟ یہ سوالات اپنی جگہ لیکن اہم سوال یہ ہے کہ اس زمانہ میں جس کے متعلق ہمارے ذہنوں میں یہ بات بٹھادی گئی ہے کہ اس دور کے لوگ ہتھوڑی، چھینی اور تانبہ کے علاوہ کسی چیز کو نہیں جانتے تھے، لوہا اور پہیہ تک سے ناواقف تھے تو سائنس، فلکیات اور ریاضی کے ان سخت اصولوں کو استعمال کرتے ہوئے آخر اتنی بڑی عمارت کیسے

کھڑی کر دی گئی جن اصولوں وعلوم سے دور جدید کے لوگ پچھلے سو دو سو سالوں میں واقف ہوئے ہیں۔

جن پتھروں سے یہ اہرام بنائے گئے ہیں وہ وہاں پر نہیں پائے جاتے، آخر ۵۰۰ سے آٹھ سو کلومیٹر دور پائے جانے والے پتھروں کو وہاں کیسے لا گیا، اگر وہیں پر بنائے گئے تو کیسے!

اہرام مصر تین قسم کے پتھروں سے بنایا گیا، اس میں لگا گرینائٹ پتھر ۵۰۰ میل دور اسوان سے لا کر لگایا جاتا تھا، ان میں سے ہر ایک کا وزن ڈھائی سے سترٹن ہے، اگر فی روز دس بلاک لگا کر کام کیا جائے تو مکمل اہرام بننے میں ۳۸۵ سال لگ جاتے ہیں۔

گرینائٹ پتھروں کی ایک جیسی کٹائی، شکل، اور ان میں بنے سوراخوں کو دیکھ کر بعض ٹکنالوجسٹ کا کہنا ہے کہ لیتھ مشین، ڈریل مشین اور الٹرا سونک مشینوں کے استعمال کے بغیر یہ کام ناممکن ہے، کیونکہ انیس سے پچیس ہزار سائکل فی سیکنڈ کے ارتعاش سے ہی گرینائٹ پتھروں میں سوراخ کئے جا سکتے ہیں، گرینائٹ کے پتھروں کو کسی اسٹین لیس اسٹیل کٹر یا لیزر ٹکنالوجی کے بغیر کاٹنا تقریبا ناممکن ہے۔،

اہرام مصر کے معماروں نے جو گرینائٹ پتھر کاٹے تھے ان کا ۵۰۰ واحصہ ہی دور جدید کی ڈائمنڈ ڈریل مشینوں کے ذریعہ کاٹا جا سکتا ہے۔

ان پتھروں کو کاٹنے اور لانے سے زیادہ بڑا کام ان دیو ہیکل چٹانوں کو اس کاریگری اور ترتیب سے فٹ کرنا ہے کہ ان کے درمیان ایک ذرہ برابر فرق نہ

رہے، ایسا کام موجودہ دور کی دیو ہیکل مشینوں کے ذریعہ بھی ناممکن ہے۔ کیا ان کے پاس کسی قسم کی اینٹی گریوٹی تکنک تھی یا پھر اعلیٰ قسم کے ہوائی جہاز؟

گزشتہ دو سو سالوں میں فلسفیوں، سائنسدانوں، آرکیالوجسٹ اور ماورائی علوم کے ماہرین نے اہرام مصر پر بہت کچھ لکھا اور بولا ہے لیکن ابھی تک کوئی بھی حتمی نتیجہ نہیں نکالا جاسکا کہ یہ کس نے، کیوں اور کس طرح اسے بنایا ہے۔ کیا یہ گزشتہ ادوار کی ترقی یافتہ انسانی ذہانت کا کمال تھا، یا اس کی تعمیر جنات جیسی کسی ماورائی مخلوق نے کی ہے یا پھر کسی دوسرے سیارے سے آنے والی خلائی مخلوق نے یہ کارنامہ انجام دیا ہے۔

یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ اس صحرائی علاقہ میں لاکھوں لوگوں کو کام پر لگا کر ایسا عظیم الشان کام انجام دیا گیا ہوگا، کیونکہ اس صحرا میں لاکھوں لوگوں کی بود و باش اور خورد و نوش کا انتظام کرنا ناممکن ہے۔ دیو ہیکل پتھروں کو درختوں کے تنوں یا چکنی ریت پر گھسیٹ لانے کی بات بھی مضحکہ خیز نظر آتی ہے۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ اہرام خوفو، خافر اور مینکاور کے بجائے موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کے فرعون نے بنائے ہوں، اگر ایسا ہے تو بات صاف ہے کہ اس کا دور جادوگری سے بھرا ہوا تھا۔

یا پھر ایسا تو نہیں کہ ان اہرام کو فراعنۂ مصر کے بجائے تیز ترین ہوائی سفر پر قادر اور چرند و پرند اور جن و انس پر حکومت کرنے والے حضرت سلیمان علیہ السلام نے تعمیر کروائے ہوں، کیونکہ ان کے لئے تو جنات بھی کام کیا کرتے تھے، کیا حالیہ

دنوں میں زیر زمین اہرام مصر سے ہوتی ہوئی مسجد اقصی کی جانب جانے والی سرنگوں کی دریافت اس رای کو مضبوط نہیں کرتی کہ اس نادرۂ روزگار کو اہرام مصر کہنے کی بجائے ہیکل سلیمانی جیسی کوئی تعمیر کہنا زیادہ صحیح ہے؟ یا پھر یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ ان کا معمار کوئی اور نہیں بلکہ ٹکنالوجی اور کیمسٹری کا بادشاہ ذوالقرنین ہی ہو، جسے اللہ تعالیٰ کی جانب سے تصرفات ارضی کا اختیار دیتے ہوئے ہر قسم کی سواری سے بھی نوازا گیا تھا۔

الغرض ان تاریخی تعمیرات کا بانی و معمار چاہے ماضی کا انسان ہو، خلائی مخلوق ہو یا پھر ماورائی مخلوق، یہ شاندار نمونے دور حاضر کی سائنسی ترقی پر ناز اور تکبر کرتے ہوئے اسے اپنے عقلی ارتقاء کا نتیجہ سمجھنے والے انسان کو آئینہ دکھا رہے ہیں کہ ماضی کے ان کارناموں کے سامنے موجودہ دور کا انسان کچھ بھی نہیں۔ قرآن نے کیا خوب کہا: وَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَمَا بَلَغُوا مِعْشَارَ مَا آتَيْنَاهُمْ فَكَذَّبُوا رُسُلِي ۖ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ ﴿٤٥ سبا﴾

أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۚ كَانُوا أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَأَثَارُوا الْأَرْضَ وَعَمَرُوهَا أَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوهَا وَجَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ ۖ فَمَا كَانَ اللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلَٰكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿٩ الروم﴾

سائنس کیا ہے؟

دور حاضر کی سائنسی ترقی عقلی ارتقاء کا نتیجہ یا خالق کائنات کے تکوینی نظام

کا حصہ؟

انسان کا عقل وشعور، اخلاقی رویہ، حلم وشجاعت، بخل وسخاوت، وغیرہ صفات ابتدائی انسان میں بھی اسی معیار کی تھیں جیسی آج ہیں، ایک رتی برابر ان میں فرق کو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ دیکھا جائے تو ماضی کا انسان قوت وشجاعت حلم وسخاوت وغیرہ صفات میں دور حاضر کے انسان سے کہیں زیادہ آگے تھا۔ ماضی کے انسان کی عقل وجسم میں آخر ایسی کیا چیز نہیں تھی کہ وہ ماضی میں اس قسم کی سائنسی ترقی کو حاصل نہ کرسکا!

آخرارتقائیوں کے مطابق جو ارتقاء کروڑوں سالوں سے آہستہ آہستہ جاری تھا وہ گزشتہ سوسالوں میں اچانک سے ایک دم کیسے ترقی کرتے ہوئے آخری منزل کے قریب پہنچ گیا!

اگر عقلی ارتقاء ہوسکتا تھا تو اس سے زیادہ تو اخلاقی ارتقاء ضروری تھا۔ کیا ان سائنسی ترقیوں نے مذہب کی ضرورت کو ختم کردیا، کیا اب اخلاقی رویہ کو اعتدال پہ رکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہی، کیا انسان بغض وحسد، کینہ ونفرت، عصبیت و انانیت جیسے رذائل سے اپنی طبیعت کو نجات دے سکا، کیا انسان نے موت پہ قابو پالیا، کیا وہ لمبی عمروں کا مالک بن پایا، کیا دور حاضر کا انسان ماضی کے انسان سے زیادہ عقلمند، خوشحال، صحت مند، طاقتور اور بہادر ہو پایا!؟ ہرگز نہیں۔

اگر یہی بات ہے کہ آج کے انسان اور ماضی کے انسان کی عقل وشعور میں کوئی فرق نہیں تو پھر یہ ٹکنالوجی وسائنسی ایجادات وانکشافات آخر ہمارے اس دور

میں ہی کیوں رونما ہوئے ، ماضی میں کیوں نہیں؟

اولاً تو یہ بات درست ہی نہیں کہ ایسی سائنسی ترقی اور انکشافات ماضی میں کبھی نہیں ہوئے چونکہ حیرت انگیز باقیات انسانی کے علاوہ فرعون مصر، سلیمان علیہ السلام اور ذوالقرنین کے واقعات اس بات کے لئے زندہ ثبوت ہیں کہ ماضی میں ایسے ایسے سائنسی انکشافات وایجادات موجود تھیں جن کا آج تصور بھی ممکن نہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر ایسی سائنسی ترقی پہلے موجود تھی جیسا کہ اس کے شواہد بھی موجود ہیں تو پھر بعد میں یہ کہاں غائب ہوگئیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ در اصل یہ ایجادات وانکشافات اللہ کے تکوینی نظام کا ایک حصہ ہیں، انسانی معاشرہ کو جب جب ضرورت پڑتی ہے تب تب کسی نہ کسی بہانے رب العلمین کی جانب سے ایسے انکشافات وجود پذیر ہوتے رہتے ہیں، ان انکشافات کا ذریعہ چاہے سلیمان علیہ السلام اور ذوالقرنین کی طرح کوئی نبی اور عام بندہ ہو یا پھر موجودہ دور کی طرح نوع انسانی کی ایک جماعت۔

جب ہم غور کرتے ہیں تو سائنس کے نام پھیلے علوم بنیادی طور پر دو بنیادی ڈھڑوں میں بٹیں نظر آتے ہیں، ایک کا تعلق صرف مفروضوں پر قائم ہیں، اور دوسرا حصہ تجرباتی ہے، تجرباتی کا بنیادی تعلق انسانی معیشت سے ہے۔

ذرہ سوچیں! ایسا کیوں کر ہوا کہ گذشتہ صدی میں جیسے ہی انسانی آبادی کی کثرت وکثافت بڑھنے لگی ٹھیک ایسے وقت میں یہ سائنسی ایجادات بھی وجود پذیر ہوتی چلی گئیں۔ معیشت کا مدار کی حیثیت رکھنے والے ہوائی جہاز، موٹر گاڑی،

ریلوے جیسے وسائل نقل وحمل، نظام مواصلات اور بنیادی ضرورت کا حصہ بن جانے والی بجلی اور پٹرول جیسی چیزوں کو ذرہ ہماری روز مرہ کی زندگی سے نکال دیکھیں، ہمارا حشر کیا ہوگا؟ ساری کی ساری معیشت ومعاشرت آناً فاناً تہس نہس ہوتی چلی جائیگی، ان چیزوں کے ساتھ ہماری عیش پرستی یا صرف روزگار کی فراوانی وابستہ نہیں بلکہ آبادی کی کثرت کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی بنیادی ضرورتیں وابستہ ہیں۔ان کے بغیر انسان کے معاشی مسائل وضرورتوں کو کنٹرول کرنا انتہائی دشوار ہے۔ الغرض انسانی آبادی کی کثافت وکثرت سے پہلے ان ایجادات و انکشافات کی ایسی ضرورت نہیں تھی جیسی کہ آج ہے۔

اب ذرہ قرآن میں بیان کردہ اس پروردگار عالم کے وعدہ پر نظر ڈالتے ہوئے اس کے طریقۂ ربوبیت کو سمجھتے جائیں۔

خَلَقَ الإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ (۴) وَالأَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيهَا دِفْءٌ وَمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ (۵) وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ (۶) وَتَحْمِلُ أَثْقَالَكُمْ إِلَى بَلَدٍ لَّمْ تَكُونُواْ بَالِغِيهِ إِلاَّ بِشِقِّ الأَنفُسِ إِنَّ رَبَّكُمْ لَرَؤُوفٌ رَّحِيمٌ (۷) وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً وَيَخْلُقُ مَا لاَ تَعْلَمُونَ (۸) وَعَلَى اللّهِ قَصْدُ السَّبِيلِ وَمِنْهَا جَآئِرٌ وَلَوْ شَاء لَهَدَاكُمْ أَجْمَعِينَ (۹) (النحل)

مذکورہ آیت میں جانوروں کی پیدائش کا مقصد اور انکے مختلف منافع بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ جانور تمہارے بوجھ اٹھا کر ایک ایسے علاقے کی طرف لے جاتے ہیں جہاں تم لوگ تن توڑ محنت کے بغیر نہیں پہنچ سکتے۔

اسی کے ضمن میں اللہ وعدہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۔ اور مستقبل میں ایسی سواریاں پیدا فرمائیگا جنہیں تم لوگ فی الحال نہیں جانتے۔

کیا اب کسی کو اس بات میں شک ہونا چاہیے کہ موجودہ دور کے ہوائی جہاز، ریل گاڑیاں اور موٹر گاڑیاں جیسے تمام کے تمام وسائل حمل ونقل اسی وعدۂ خداوندی کی تعبیر ہیں جو اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اسلام کی زبانی چودہ سو سال پہلے قرآن میں بیان فرمایا تھا۔

خَلَقَ الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ ۔ انسان کو نطفہ سے پیدا کیا، لیکن وہ تو کھلم کھلا مدمقابل بن بیٹھا۔

یہ آیت جانوروں کے منافع بیان کرنے کے بعد مستقبل میں بالکل مختلف قسم کی سواریاں عطا کرنے کے وعدہ سے پہلے کی ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے انسان کو نطفہ سے پیدا کیا یعنی انسان ذرہ غور کرے کہ بشکل منی نطفہ کے لئے رحم مادر کی شکل میں پہلے سے انتظام موجود ہے، جب وہ رحم میں پرورش پا کر باہری دنیا میں آنے کی تیاری میں ہوتا ہے تو ماں کی دودھ کی شکل میں باہر اسکا انتظام ہونا شروع ہوجاتا ہے، آخر کون ہے جو ہماری تمام ضرورتوں سے واقف ہے اور ربوبیت کا سارا انتظام کرتا جارہا ہے، جو خدا یہ سب کرتا جاتا ہے کیا وہ یہ نہیں جانتا کہ نوع انسانی مستقبل میں کن کن مسائل سے دوچار ہونے والی ہے ۔ یقیناً وہ سب کچھ جانتا ہے، اسی لئے اس نے وعدہ کرتے ہوئے فرمایا تھا: ویخلق مالا تعلمون ۔ لیکن افسوس کہ انسان نظام ربوبیت کو فطرت کے اندھے بہرے

قوانین کے نتائج کہتے ہوئے خالق کائنات کا انکار کر بیٹھتا ہے۔

اگر یہ سب ایجادات وانکشافات انسانی عقل وشعور کے ارتقاء کا نتیجہ ہوتے تو پھر ساری کی ساری نوع انسانی کو سائنس داں ہونا چاہیے تھا، جبکہ یہاں تو ان نظریات کو سمجھنا ہی اکثر بندوں کے بس کی بات نہیں، ذرہ غور کریں کہ نظریہ اضافیت صرف آئن سٹائن کے دماغ میں ہی کیوں کر رونما ہوا؟ جبکہ عام سائنسداں تو اسے سمجھنے سے ہی قاصر ہیں۔

ہمارے سامنے سائنس کے نام پر ایجادات کا جو انبار لگا ہے، جب ان پر غور کیا جائے تو انکی بنیاد میں محض چند ایجادات و انکشافات ہیں، اگر ان بنیادی ایجادات کے موجدین کے واقعات کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان ایجادات کے پیچھے کارفرما اصول ونظریات کا انہیں یکا یک ہی خیال آیا تھا، بسا اوقات ایسا ہوا کہ کسی دوسری چیز کی تلاش وجستجو جاری تھی کہ اچانک انہیں کوئی اور کارآمد ایجاد مل جاتی ہے۔ ذہن میں آنے والا ایک ہی خیال مشاہدہ وتجربہ کی کسوٹی پر آنے کے بعد بے شمار ایجادات کا موجب بنتا چلا جاتا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ یہی وہ القاء ہے جو نوع انسانی کی ضرورت وسہولت کے لئے پروردگار کی جانب سے اپنے چند بندوں کے ذہن میں ہوتا رہتا ہے۔

یہ القاء کسی کے بھی ذہن میں ہوسکتا ہے، کافر ومؤمن، اور نیک و بد کے درمیان کوئی تفریق نہیں، اللہ اپنا حق ربوبیت ادا کرتا رہتا ہے۔

الغرض قرآن نے صرف ماضی کی قوموں کی ہلاکت اور ان کے پاس

موجود ترقی یافتہ اسباب و وسائل کا ہی تذکرہ نہیں کیا بلکہ آخری امت کن کن منزلوں کو طے کرنے کے علاوہ دنیا کے لئے کس قدر تباہ کن ثابت ہونے والی ہے، ان سب کو بھی صاف لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔

آج ہم جس سائنسی ترقی یافتہ کہے جانے والے دور میں جی رہے ہیں اس سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ ماضی کا انسان تھا، اور مستقبل کا انسان آج سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ ہوگا۔ قرآن کے مطابق انسان آفاق و انفس کا خوردبینی و دوربینی مطالعہ کے علاوہ سیاروں کا سفر تو کرنے ہی والا ہے لیکن نظام شمسی سے بھی نکل جانے کی کوشش کریگا۔ ہوسکتا ہے انسان وسائل حمل و نقل میں اس حد تک کامیابی حاصل کر لے کہ پلک جھپکنے سے پہلے ہی بھاری بھرکم چیزوں کو سینکڑوں اور ہزاروں کلومیٹر دور تک منتقل کرنے میں کامیاب ہوجائے۔ وغیرہ وغیرہ

لیکن تکوینی نظام کے تحت ملنے والی ان خداداد سہولتوں کے ساتھ انسان کا امتحان بھی مقصود ہوتا ہے کہ دیکھیں انسان ان کا کیا کرتا ہے، ذوالقرنین کے نائب بنکر انسانیت کی فلاح و بہبودی کے لئے اپنا فریضہ پورا کرتا ہے یا پھر ان انکشافات کو خود انسانیت کی تذلیل و بربادی کے لئے استعمال کرتے ہوئے دنیا کو قیامت کے دروازے پر لا کھڑتا ہے۔

عبدالعزیز ابن احمد

ٹیپو سلطان کالونی، کنتھاریا، بھروچ، گجرات، انڈیا۔ ۳۹۲۰۱۵

موبائل: ۰۰۹۱۹۷۱۴۴۴۴۵۰